مُدیر:
نوید ظفر کیانی

اردو طنز و مزاح پر مبنی دوماہی برقی مجلّہ

ارمغانِ ابتسام

مئی، جون ۲۰۱۹ء

شمارہ نمبر ۲۱

مدیر:

نوید ظفر کیانی

مشاورت:

کے ایم خالد

خادم حسین مجاہد

روبینہ شاہین

محمد امین

http://www.facebook.com/groups/837838569567305/

برقی ڈاک کا پتہ برائے خط و کتابت

mudeer.ai.new@gmail.com

کیا، کیا، کہاں، کہاں

قسطوں قسط

جستہ جستہ

مزلیات و غزلیات

ہسپتالیات

انشائیے

ارمغانِ ابتسام کے گزشتہ شمارے

https://archive.org/details/@nzkiani

اداریہ

شرگوشیاں

ویسے تو تنقید کی کئی قسمیں ہوتی ہیں لیکن بنیادی طور پر تنقید دو ہی قسم کی ہوتی ہے، تنقید برائے تنقید اور ادبی تنقید۔ تنقید برائے تنقید ہر کوئی ہر وقت ہر جگہ اور ہر چیز پر کرسکتا ہے اور کرتا ہے کیونکہ اس کے لئے کسی علم اور سلیقے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے، بس کچھ مخاصمت، کچھ فرصت اور بہت زیادہ بے عملی کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ کچھ کرنے والوں کو کسی پر تنقید کی فرصت ہوتی ہے نہ ضرورت، اسی لئے ناکام لوگ سب سے زیادہ نکتہ چینی کرتے ہیں کیونکہ جب وہ صلاحیت کے میدان میں کسی کا مقابلہ نہیں کرسکتے تو تنقید برائے تنقید سے کام لیتے ہیں، یہی تنقید آگے چل کر بعض اوقات طنز کی شکل اختیار کرلیتی ہے اور یہ تنقید کی ذرا بہتر صورت ہے، جس میں کچھ سلیقہ اور مہارت جھلکتی ہے لیکن اس کی تہہ میں زہر زیادہ ہوتا ہے لیکن اگر اس کے ساتھ مزاح ہو تو زیادہ موثر ہوتی ہے ورنہ ردِ عمل پیدا کرتی ہے، جس کے نتائج خطرناک بھی ہو سکتے ہیں۔

تنقید کے ماہر تو سبھی ہوتے ہیں لیکن طنزیہ تنقید کی ماہر زیادہ تر بیویاں ہوتی ہیں جس سے شائد ہی کوئی شوہر محفوظ ہو۔ مزید ستم ظریفی یہ ہے کہ عورتیں اپنے طنز میں مزاح ملانا قطعاً پسند نہیں کرتیں کہ کہیں وہ خوشگوار ہوکر بے اثر نہ ہوجائے۔

تجربات بتاتے ہیں کہ تنقید اور طنز کے کچھ فوائد بھی ہیں کہ اس سے انسان کو اپنی خامیوں کا علم ہوتا ہے اور مزید طنز یا تنقید سے بچنے کے لئے انسان اپنی اصلاح کی کوشش کرتا ہے۔ بے شمار ناکام لوگوں کے پھر سے کامیاب ہونے کے پیچھے عموماً لوگوں کی تنقید یا طنز ہوتا ہے حالانکہ یہ منفی جذبہ ہے، پھر بھی یہ خوشامد سے بہتر ہے، جس میں خامیوں کو بھی خوبیاں بنا کر پیش کیا جاتا ہے، جس سے انسان کی اصلاح و ترقی رُک جاتی ہے۔

ادبی تنقید کی آگے بے شمار قسمیں ہیں لیکن ہم صرف ان قسموں کو بیان کریں گے جن کو عموماً بیان نہیں کیا جاتا بلکہ خوشنما لفظوں اور اصطلاحات کے پردوں کے پیچھے چھپا دیا جاتا ہے۔

اِن میں سب سے پہلی قسم ''تنقید برائے تذلیل'' ہے۔ اس میں اچھی خاصی تحریر کو تنقید کی سان پر چڑھا کر اس میں ایسی ایسی خامیاں نکالی جاتی ہیں کہ لکھنے والا پڑھ کر لکھنے سے توبہ تائب ہوجائے اور ایسی تنقید کا مقصد بھی عموماً یہی ہوتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس کا مصنف یا تو نیا ہوتا ہے اور اس نے کسی ادبی سلسلے میں بیعت نہیں کی ہوتی یا مخالف گروہ سے تعلق رکھتا ہے یا اس نے ناقدین کو کوئی اہمیت دیئے بغیر میدانِ ادب میں جھنڈے گاڑنے کی جسارت کی ہوتی ہے۔

تنقید کی دوسری خفیہ قسم ''تنقید برائے تحسین'' ہوتی ہے، جس میں ردی سے ردی تحریر کا درجہ غالب اور اقبال کی تحریروں کے برابر قرار دے دیا جاتا ہے اور تحریر اگر کسی صاحبِ اقتدار کی ہو تو ان سے آگے بھی بڑھا دیا جاتا ہے۔ یہ خوشامدانہ تنقید عموماً اپنے گروپ کے مصنفین کی تحریروں پر کی جاتی ہے یا ان تحریروں پر جن کے مصنفین نے تنقیدی باوؤں کی کماحقہ' خوشامد یا خدمت کی ہوتی ہے۔

تنقید کی تیسری خفیہ قسم ''متنازعہ تنقید'' کی ہوتی ہے، جس میں جان بوجھ کر کچھ تحریروں کو متنازعہ بنا کر پیش کر دیا جاتا ہے اور ان سے وہ باغیانہ یا اختلافی نکات تلاش کرلئے جاتے ہیں جو مصنفین کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتے۔ اس کی وجہ عموماً ذاتی یا گروہی دشمنی ہوتی ہے اور یہ تنقید ارادتاً قتل سے کم نہیں ہوتی، یہ الگ بات ہے کہ ایسی تنقید سے بعض اوقات مصنف زیادہ مشہور ہوجاتے ہیں۔

خادم حسین مجاہد

خضاب

شوکت تھانوی

ہم صبح سو کر بھی نہ اٹھے تھے کہ نوکر نے آ کر جگا دیا۔ ''میر صاحب آئے ہیں کہتے ہیں ضروری کام ہے جگادو۔''

ہم فوراً اٹھ بیٹھے اور نوکر سے کہا کہ میر صاحب قبلہ کو نہایت احترام کے ساتھ کرسی پر نہیں بلکہ آرام کرسی پر بٹھا دے ،اَبے دیکھنا! کوئی گستاخی یا بدتمیزی نہ سرزد ہونے پائے۔ میر صاحب قبلہ والدِ محترم کے خاص احباب میں سے ہیں، میں ابھی ایک منٹ میں آیا۔ حقہ لیتا جا اور پان کے لئے کہہ دے۔

قصہ اصل میں یہ تھا کہ یہ میر صاحب والد مرحوم کے اُن احباب میں سے تھے، جن کا والد بہت احترام کرتے تھے۔ اوّل تو عمر میں والد سے بڑے تھے، دوسرے کچھ استادی شاگردی کا معاملہ بھی تھا۔ مختصر یہ کہ والد صاحب ان کو ہمیشہ سر آنکھوں پر جگہ دیتے تھے، لہٰذا ہمارے لئے میر صاحب کس حد تک واجب التعظیم ہو سکتے ہیں، وہ ظاہر ہے۔

چنانچہ اُن کی آمد کی خبر سنتے ہی ہم نے نوکر کو تو آگے بھیجا اور ایک آدھ کلی کر کے منہ پونچھتے ہوئے پیچھے پیچھے ہم بھی پہنچ گئے۔ جاتے ہی ہم نے جھک کر سلام کیا۔ میر صاحب قبلہ نے نہایت شفقت سے گلے لگا لیا اور ہم دونوں بیٹھ گئے۔ میر صاحب قبلہ آرام دہ کرسی پر اور ہم ان کے مقابل ایک مونڈھے پر دست بستہ۔

میر صاحب قبلہ نے گھر کی خیریت وغیرہ پوچھی اور اس رسمی سوال و جواب کے بعد ناک کی پھنگی پر اٹکی ہوئی عینک سے اپنی نظر کو پھندا کر اور ایک معشوقانہ انداز کا تبسم اپنے سمٹے سمٹائے چہرے

پر پیدا کر کے داڑھی کو انگشت شہادت سے کھجاتے ہوئے بولے ''بیٹا اس وقت ایک خاص کام سے آیا ہوں۔۔۔ہیں ہیں۔۔۔ہیں۔ہیں۔۔۔''

ہم اور بھی زیادہ سعادت آثار طولِعمرہٗ بن گئے اور کھیسیں نکال کر دست بستہ عرض کیا''حضور ارشاد فرمائیں اور مجھ کو بھی موقعہ دیں کہ میں کوئی سعادت حاصل کرسکوں۔''

اُسی غارتگر تبسم کے ساتھ پوپلے منہ میں گندھنے والے آٹے کی سی جنبش پیدا کر کے بولے''ہیں، کیا کہوں، کہتے ہوئے بھی تو حجاب آتا ہے۔''

ہم نے سوفیصدی کفش بردار بن کر عرض کیا''میں تو خادم ہوں مجھ سے حجاب آنا۔۔۔یہ تو نئی بات ہے۔آپ ارشاد فرمائیں میں تو ہر خدمت بجالانا عین سعادت سمجھتا ہوں بلکہ اپنی خوش قسمتی پر ناز کروں گا کہ میں بھی آپ کے ایسے بزرگ کے لئے کسی قابل ثابت ہوا۔''

ایک غارتگر تمکین و ہوشربا لچک کے ساتھ اٹھلا کر ہنستے ہوئے بولے''بیٹا، قصہ اصل یہ ہے کہ اب چاہے تم اس کو بڑ بس سمجھو یا اپنے بڈھے چچا پر ہنسو مگر ہیں ہیں ہیں ہیں۔۔۔یعنی کہ یہ صورت ایسی پیدا ہوگئی ہے کہ۔۔۔لاحول ولاقوۃ۔۔۔ہیں ہیں ہیں مطلب یہ کہ میں نے شادی کے لئے ایک جگہ نسبت دے دی ہے۔''

میر صاحب کے یہ الفاظ سنتے ہی ہم کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ قصہ دراصل یہ ہے کہ والد صاحب کے انتقال کے بعد ہم پر ہر طرف سے زور ڈالا جا رہا تھا کہ ہم اپنا گھر بسالیں مگر ہم بوجوہ اس کے فی الحال مخالف تھے اور اپنے گلے میں یہ سنتِ پیغمبری نہیں ڈالنا چاہتے تھے لیکن اب سوال یہ تھا کہ میر صاحب قبلہ سے کیونکر انکار کریں، اس لئے کہ مارے ادب کے یہ حال تھا کہ عرضی فدوی بن کر رہ گئے تھے۔معمولی باتوں پر تو زبان کھولنا دشوار تھا، چہ جائیکہ شادی بیاہ کا مسئلہ اور پھر وہ بھی انکار، بہر حال بہ مشکل تمام ہچے لگا لگا کر اور ہکلا ہکلا کر ہم نے عرض کیا''آپ کو معلوم ہوگا کہ مجھ کو دراصل والد صاحب قبلہ کے برابر ہی بلکہ اس سے زیادہ آپ کا خیال ہے اور آپ کے حکم میں انکار کی مجال نہیں مگر اس فلسفہ میں کچھ ایسی ہی وجہ ہے کہ میں آپ سے گزارش کروں گا کہ فی الحال مجھ کو آزاد رہنے دیا جائے۔''

میر صاحب نے سٹپٹا کر کہا''نہیں بیٹا، تم نہیں سمجھے شاید۔۔۔میرا مطلب یہ ہے یعنی میں نے خود نسبت دے دی ہے۔''

ہم نے پھر ہیچمداں بن کر شرماتے ہوئے کہا''جی ہاں میں سمجھ گیا، یقیناً آپ کو یہ اختیار تھا اور ہر وقت یہ حق حاصل ہے کہ آپ نسبت دے دیں اور مجھ سے کچھ نہ پوچھیں لیکن میں عرض کروں گا کہ مجھ کو کم از کم دو تین سال آزاد رہنے دیجئے۔''

میر صاحب نے جز بز ہو کر کہا''لاحول ولاقوۃ۔۔۔تم پھر نہیں سمجھے، میں کہہ رہا ہوں کہ میں نے نسبت دی ہے۔''

میر صاحب کے اس غصے سے مرعوب ہو کر میں نے بغیر سوچے سمجھے کہہ دیا''بہتر ہے تو پھر جو آپ کی مرضی ہو، میں تیار ہوں۔''

اب بھی میر صاحب کو اطمینان نہیں ہوا بلکہ حالت کچھ اور وگرگوں ہوگئی اور وہ یکایک چیخ اٹھے''ارے تم کیا کہہ رہے ہو۔۔۔میں بار بار کہہ رہا ہوں کہ میں نے نسبت دی ہے یعنی اپنی نوبت اپنی شادی کے لئے، میں اپنا گھر بسانا چاہتا ہوں سمجھے یا اب بھی نہیں۔''

ہم یکایک چونک پڑے اور غیر ارادی طور پر منہ کھول کر صرف یہ کہہ سکے''آپ؟''

کہنے لگے''ہاں میاں، میں نے ہی اپنی نسبت دی ہے، تعجب بعد میں کرنا اور ہنسنا بھی بعد میں ہی، فی الحال صرف یہ سن لو کہ میری عمر اب شادی کی یقیناً نہیں ہے مگر قبر میں پیر لٹکا کر شادی کر رہا ہوں، آخر اس کی بھی کوئی وجہ ہی ہوگی۔۔۔بہر حال اب اس نسبت کا تمام دارومدار صرف تم پر ہے۔''

ہم نے حیرت سے کہا ''مجھ پر انحصار ہے؟''

پان کو ایک داڑھ سے دوسری داڑھ میں بدلتے ہوئے پوپلا کر بولے''ہاں تم پر انحصار ہے، جس لڑکی سے میری نسبت طے ہو رہی ہے، وہ ابھی بہت کم عمر ہے لہٰذا میں نے بھی مصلحت اسی میں

دیکھی کہ نسبت کے خط میں اپنے کو جوان العمر لکھ دیا۔ اب وہاں سے مصیبت یہ نازل ہوئی ہے کہ دولہا کو یعنی مجھے "بردکھوے" کے لئے یعنی بغرض پسندیدگی بلایا گیا ہے اور میں یہ ڈر رہا ہوں کہ میں بجنسہ چلا گیا تو یہ نسبت قیامت تک طے نہیں ہوسکتی، لہٰذا رات کو میری نظرِ انتخاب تم پر پڑی کہ بردکھوے کے لئے تم کو بھیج دوں تاکہ نسبت تو کم از کم پختہ ہو ہی جائے، پھر دیکھا جائے گا۔"

اُس بڈھے کی اس مجرمانہ جسارت دیکھ کر ہم دنگ رہ گئے اور یقین جانیے اگر یہ کھونسٹ والد صاحب کا قابلِ احترام دوست نہ ہوتا تو اس وقت ہمارے ہاتھ سے پٹ جاتا مگر مجبور تھے، کیا کرتے مگر یہ واقعہ ہے کہ ہم اس کی اس تجویز سے بوکھلا گئے اور سوائے اس کے کوئی جواب نہ دے سکے کہ یہ کیونکر ممکن ہے۔

بڑے میاں نے اپنے رخِ روشن کو چھوہارا بناتے ہوئے فرمایا "کیوں۔۔۔ کیوں کر ممکن نہیں، بس تمہارا اتنا کام ہے کہ آج رات میں جہاں کہوں وہاں چلے جاؤ اور ذرا شرمائے شرمائے سے رہو۔ اس کے بعد تو جو کچھ ہوگا، اس کا براہ راست تعلق مجھ سے ہے۔"

ذرا یہ پاسِ ادب ملاحظہ فرمایئے گا کہ ہم نے اس جرم میں شرکت کے لئے یہ کہہ کر اقرار کرلیا کہ "بہرحال میں تعمیل کے لئے حاضر ہوں۔"

میر صاحب نے تھوڑی دیر تک ہم کو تمام نشیب وفراز سے آگاہ کیا جو اس موقع پر پیش آنے والے تھے، اس کے بعد مغرب کے بعد نازل ہونے کا فرما کر خس کم جہاں پاک ہوگئے۔

ایک معصوم دوشیزہ، ایک الھڑ لڑکی اور ایک بیگناہ حسینہ کو زبردستی اس ٹوٹی قبر کے سپرد کرنا، اس بیچاری کی قسمت اس پٹاری کے انگور سے پھوڑنا اور اس کی جوانی کو اس مویزِ منقّیٰ پر قربان کرنا دراصل ایسا گناہ تھا جس کی سزا صرف جہنم کے کسی طبقہ میں بھی شائد ممکن نہ ہو۔ لیکن یہ کمبخت میر صاحب، خدا ان کو غارت کرے اسی پھیر تلے ہوئے تھے کہ ایک بے گناہ کی زندگی تباہ کریں گے خیر ان کا جو کچھ حشر ہوگا سو ہوگا مگر خدا ہم کو معاف کرے کہ اس گناہ عظیم میں مارے ادب کے ہم بالکل برابر کے حقدار بن رہے تھے۔ آپ یقین جانئے کہ اس سلسلہ میں ہمارا ضمیر ملامت کرتے کرتے انتقال کر چکا تھا، اور ہم پشیمان ہوتے ہوتے بالکل بے حس بن چکے تھے، اس کو میر صاحب کا سحر کہیئے یا ہماری حماقت کہ ہم بعد از مغرب میر صاحب کے نوکر کے ہمراہ بنے ٹھنے لچکتے بل کھاتے ؎

شور ہر سمت ہوا مار چلا مار چلا

کے مصداق بنے ہوئے میر صاحب کی ہونے والی سسرال تشریف لے گئے۔ وہاں پہنچتے ہی ہمارا سر آنکھوں پر خیر مقدم کیا گیا اور ہم نہایت اہتمام کے ساتھ ایک ایسے کمرے میں بٹھا دئے گئے جو دراصل مردانہ کمرا تھا لیکن اس میں ایک طرف دروازے پر چلمن پڑی ہوئی تھی۔ ہم فوراً سمجھ گئے کہ اس وقت ہم زنانہ اور مردانہ دونوں قسم کے رسائل کے لئے بغرض ریویو یہاں بیٹھے ہیں اور ہم پر نقادانہ نظریں ہر طرف سے پڑ رہی تھیں۔ بہر صورت ہم اپنے نزدیک نہایت حسن کے ساتھ اس "جو نما گندم فروشی" میں حصہ لے رہے تھے کہ یکا یک چلمن کے پیچھے سے آواز آئی۔ پھر کھسر پھسر سنائی دی۔

"بھولا بھالا ہے۔"

"ابھی کم عمر ہے۔"

"دیدہ دلیری اور چالاکی بھی نہیں معلوم ہوتی۔"

"شریفوں کی سی صورت ہے۔"

"آنکھ بڑی پیاری ہے۔"

"رنگ کھلتا ہوا گیہواں ہے۔"

"خیر ننھی کی قسمت سے دولہا بھی اچھا ملا۔"

"اے ہے ماشااللہ سے جامہ زیب بھی ہے۔"

"بیچارہ شرمایا جارہا ہے۔۔۔ کوئی غریب کو پان تک نہیں دیتا۔"

"چشمہ لگاتا ہے۔۔۔ انگریزی پڑھنے والے تو آنکھوں کو کھو ہی دیتے ہیں۔۔۔ مگر بہن ہم کو تو اچھا لگا۔۔۔ جی چاہتا ہے کہ ابھی ننھی کا ہاتھ پکڑا دیں کہ لو میاں لیتے جاؤ۔"

"اے ہٹو بھی۔۔۔ اے چلو بھی۔۔۔"

اُس وقت ہمارا تو یہ حال تھا کہ ایک طرف تو اس خیال سے جسم میں خون منجمد تھا کہ اگر کہیں بھانڈا پھوٹ گیا تو یہ لوگ مارتے مارتے ہم کو میر صاحب بنا دیں گے اور دوسری طرف اپنی شان میں یہ قصائدِ لطیف جن کے فی الحال ممدوح ہم ہی تھے لیکن گریز میر صاحب قبلہ کی طرف ہونے والی تھی، ہم کو مارے فخر کے واقعی حسین بنائے دیتے تھے۔ بہرحال ہم ایک عجیب عالم میں وہاں بیٹھے تھے کہ یکا یک ہمارے لاحول ولاقوۃ میر صاحب کے ہونے والے خسر نے پوچھا "تو آپ کے والد نے دو شادیاں کی تھیں؟"

اب بتائیے کہ ہم یہاں کیا کہہ سکتے تھے۔ اگر سچ پوچھئے تو ہمارے والد سے مراد میر صاحب کے والد سے تھی، لہٰذا ہم نے کہا "جی ہاں دو شادیاں ہوئی تھیں۔"

دلہن کے قبلہ وکعبہ نے بات پوچھنے کے بعد بات کی جڑ پوچھی "آپ کی والدہ پہلی تھیں یا دوسری؟"

سچ پوچھئے تو اس سوال نے ہمیں چکرا دیا، اس لئے کہ یہ راز ہم کو بھی میر صاحب نے نہیں بتایا تھا اور ہمارے خیال میں نسبت کے طے ہونے کا سارا دارومدار اسی سوال پر تھا۔ بہرحال ہم نے بسم اللہ کہہ کر بغیر سوچے سمجھے کہہ دیا "جی ہاں، پہلی دوسری۔"

اُن حضرت کو شاید ثقلِ سماعت کی بھی شکایت تھی، چنانچہ کان پر ہاتھ رکھ کر بولے "کیا فرمایا آپ نے؟"

اب ہم نے جان پر کھیل کر واجبی بات کہہ دی "میری والدہ پہلی تھیں۔"

خسر صاحب معظم ومحترم کا چہرہ گلاب کی طرح شاداب ہو گیا۔ غالباً ہم نے صحیح جواب دیا تھا۔ لہٰذا ہماری جان میں جان آگئی اور ان حضرت نے کہا "یہ کہئے، ہاں صاحب، اب اطمینان ہوا۔۔۔ اس لئے کہ معاف کیجئے گا، میں آپ کی دوسری والدہ کے خاندانی معاملات کی طرف سے مطمئن نہیں ہوں بلکہ سنا تو یہ بھی ہے کہ وہ شاید ڈومنی تھیں۔ مجھ کو دراصل آپ سے صرف اسی بات کی تصدیق کرنا تھی کہ آپ کا تعلق چھوٹے محل سے تھا یا بڑے محل سے، بہرحال اب یہ شبہ دور ہوا اور میں بہت خوش ہوں۔"

ہم نے ان حضرت سے خیر کچھ نہیں کہا مگر ہم کو سولہ آنے یقین ہوگیا کہ جناب میر صاحب قبلہ یقیناً دوسری بیوی کے سلسلہ کی پہلی کڑی ہیں اور ان کی والدہ کے متعلق یہ روایت کہ وہ ڈومنی تھیں، اس لئے صحیح معلوم ہوتی ہے کہ کسی شریف اور کنواری لڑکی کو سوائے ایک ڈوم کے اور کوئی اس طرح کی ہلاکت اور تباہی کی طرف نہیں کھینچ سکتا۔

میر صاحب کے ہونے والے خسر نے فوراً ہم کو نہایت لاجواب قسم کی چائے پلائی۔ ہم چائے پی رہے تھے اور کیک کھا رہے تھے۔ اُدھر چلمن کے پیچھے ہم پر تنقیدات کا سلسلہ جاری تھا۔ غالباً اس وقت ہمارا کسی کے ساتھ موازنہ ہو رہا تھا اس لئے کہ ہم نے یہ بھنک سنی "وہ نائی بچہ صورت سے ہی نائی معلوم ہوتا تھا۔

ہاں ہاں، ان میں خدا نہ کرے یہ بات ہو۔۔۔ ان کی صورت پر شرافت کے ساتھ ساتھ بھولا پن برس رہا تھا، وہ کمبخت تو صورت سے ہی سر مونڈھنے والا معلوم ہوتا تھا۔

ان کی باتیں بھی ڈھنگ کی ہیں۔

شیطان نے میرا تعارف کرایا۔

"آپ کمیونسٹ ہیں یا سوشلسٹ؟"

"پتہ نہیں!"

"تو پھر امپیرلسٹ ہوں گے؟"

"جی نہیں۔"

"تو پھر آپ ہیں کیا؟"

"انسان ہوں۔"

"آپ انسان ہرگز نہیں ہیں، جب تک آپ کم از کم عیشلسٹ نہ ہوں۔"

"ان سب میں کیا فرق ہے؟"

"تو گویا آپ کو فرق بھی نہیں معلوم۔ غضب خدا کا، سچ مچ میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ ایک رائسٹ ایک مارکسٹ سے کیوں خفا ہے۔ ایک فاشسٹ ایک انرکسٹ سے کیوں اچھی طرح پیش نہیں آتا۔ رائسٹ کیوں علیحدہ رہتے ہیں۔ میرے خیال میں ہر شخص شروع میں سوشلسٹ ہوتا ہے، کچھ دیر بعد وہ ترقی کر کے کمیونسٹ بن جاتا ہے۔ پھر ایگوئسٹ۔۔۔۔ سچ مچ، ہمارے نوجوان کتنے بے بہرہ ہیں۔

ڈاکٹر شفیق الرحمٰن

توبہ کرو، وہ سویا کھر پہ تھا کھرپا۔۔۔اے میں اپنی خشی پر سے ایسے کھرپوا ،کو نچھاور بھی نہ کروں۔

خیر خدا ملادے، یہ جوڑی اچھی ہے۔''

ہر ہر جملہ پر ہمارا دل چاہتا تھا کہ اٹھ کر سلام کرلیں یا از راہ کسر نفسی کم سے کم یہ ہی کہہ دیں کہ ہم کس قابل ہیں، یہ سب میر صاحب کا فیض ہے مگر بحیثیت ایک امیدوار بلکہ مجوزہ نوشہ کے، ہم کو گھونگھٹ میں رہنا چاہیے تھا، لہٰذا ہم چائے پینے کے بعد تھوڑی دیر تک تو خاموش رہے اور پان اس انداز سے چباتے رہے کہ کھانے کی ادا بھی چلمن کے اندر ناپسند نہ ہونے پائے اور اس کے بعد میر صاحب کے مستقبلی خسر سے اجازت طلب کر کے چلے آئے۔ خدا کا لاکھ لاکھ احسان کہ اس نے آبرو رکھ لی۔

شادی کے دن صبح ہی سے میر صاحب نے ہم کو بلا بھیجا اور اب جو ہم وہاں جا کر دیکھتے ہیں تو دنیا ہی نرالی تھی۔ نہ سر پر دھوپ تھی نہ پلکوں اور بھوؤں پر چپکی ہوئی روئی۔ نہ مونچھوں کی جگہ سفید بلی کی دم کا ٹکڑا اور نہ داڑھی پر چونے کی قلعی بلکہ سر سے پیر تک کولتار کا ٹریڈ مارک بنے ہوئے ایک بیس سالہ نوجوان کی طرح بالکل اپنے پوتے کا ہم عمر بن کر بیٹھے آئینہ دیکھ رہے تھے۔ سامنے خضاب کی کئی شیشیاں اور متعدد پیالیاں تھیں اور ہاتھ میں برش۔ ہم کو دیکھتے ہی خضاب لگاتے لگاتے کھڑے ہو گئے ''آؤ بیٹا، تمہارا ہی انتظار تھا بیٹھ جاؤ۔۔۔ادھر بیٹھو، میرے قریب آ کر کچھ ضروری مشورے کرنا ہیں۔'' یہ کہہ کر ملازم سے فرمایا کہ کسی کو بغیر پوچھے یہاں نہ آنے دینا۔

نوکر کے جانے کے بعد آپ نے ادھر ادھر دیکھ کر فرمایا ''اور تو بیٹا خدا کے فضل سے اور تمہاری مہربانی سے سب کچھ طے ہو گیا مگر اب آخری مہم سر کرنا ہے۔''

دودھ کا جلا مٹھا پھونک پھونک کر پیتا ہے لہٰذا ان کے الفاظ سنتے ہی ہم گھبرا گئے اور قطع کلام کر کے عرض کیا ''مگر اب میں بھلا کیا کر سکتا ہوں؟''

میر صاحب نے غالباً ہماری سراسیمگی کو تاڑ لیا چنانچہ ہماری پیٹھ ٹھونک کر کہنے لگے ''تم سے اب کیا مطلب۔ کیا اب میں نکاح بھی تم سے کرادوں گا ہاہاہاہا۔۔۔میں تو یہ کہہ رہا تھا خدا کرے یہ آخری منزل بھی عزت و آبرو کے ساتھ فتح ہو جائے۔ ذرا دیکھنا خضاب وغیرہ تو ٹھیک ہے نا؟''

اب ہم کو بالکل اطمینان ہو گیا تھا، لہٰذا اپنی طرف سے بے فکر ہو کر ان کا خضاب دیکھا۔ جو واقعہ تھا ان سے کہہ دیا کہ چچا خضاب تو ٹھیک لگا ہے مگر دو باتیں ہیں، اوّل تو یہ کہ خضاب کا رنگ سیاہ نہیں بھورا ہے، جس سے وہ صاف خضاب ہی معلوم ہوتا ہے، دوسرے ابھی ٹھیک طرح لگا بھی نہیں ہے۔

میر صاحب نے جلد جلد برش کے ہاتھ ریش مقدس کے گھنے جنگل میں مارتے ہوئے کہا ''کیا بتاؤں، آسان صورت تو یہی تھی کہ تمہاری طرح اس خرافات کا استرے سے صفایا کر دیا جاتا مگر وہی ناں کہ دنیا ہنسے گی۔''

ہم نے بھی اس تجویز کی تائید محض اس لئے نہ کی کہ داڑھی کے غائب ہونے کے بعد رُخِ روشن کی میمونیت اور بھی نمایاں ہوئی جاتی تھی اور جو جھریاں ابھی تک داڑھی کے زیر سایہ چھپی ہوئی تھیں، وہ بھی نگاہوں کے سامنے آجاتی تھیں۔ پھر بھی میر صاحب نے داڑھی کے رنگ کو قدرتی بنانے کے لئے صبح کا ستارہ خضاب چھوڑ کر حمید یہ خضاب کا بکس اٹھایا اور ماجو کے خضاب کو گھولنے کا علیٰحدہ حکم دیا۔ ان جملہ اقسام کے خضابوں کو جمع کرنے کے بعد آپ بولے ''خیر خضابوں کا قصہ تو طے ہو ہی جائے گا، اب یہ بتاؤ کہ مجھ کو نکاح کے وقت تک کم سے کم پردۂ راز میں رہنا ہے، اس کی کیا ترکیب کی جائے؟''

ہم نے واقعی اس نزاکت پر غور کرنے کے بعد جواب دیا ''سب سے پہلے تو یہ کیجئے کہ مقررہ وقت سے دیر میں پہنچنے کی کوشش کیجئے تا کہ اوّل تو روشنی کم ہو جائے دوسرے آپ کے انتظار میں پریشان ہو کر تھک جانے والے دلہن کے اعزاء بغیر دیکھے بھالے جلدی سے نکاح وغیرہ کر دیں۔''

میر صاحب گویا اچھل پڑے ''ماشاللہ، کیا ذہن پایا ہے، بالکل باپ ایسا، بہت اچھا یہی ہوگا، احتیاطاً گلو بند وغیرہ میں خود اپنے چہرے کو لپیٹ لوں گا اور بیٹا تم چلو گے ہی، میرے قریب رہنا مجھ کو

ہر بات بتاتے رہنا۔"

ہم نے فوراً کہا "ایسا غضب بھی نہ کیجئے گا کہ مجھ کو ساتھ لے جائیے۔۔۔ اس لئے اگر مجھ کو کسی نے وہاں پہچان لیا تو آپ بھی پہچان لئے جائیں گے اور دونوں مصیبت میں پھنس جائیں گے۔"

میر صاحب کے ذہن میں بھی یہ بات آگئی اور یہ پروگرام طے ہوگیا کہ بارات روانہ کرنے کے بعد ہم گھر چلے جائیں گے اور پھر برات کی واپسی کے وقت موجود ہوں گے۔ اس درمیان میں میر صاحب پر جو کچھ گزرے گی، اس کے ذمہ دار وہ خود ہوں گے۔ پروگرام طے ہو جانے کے بعد میر صاحب نے خضاب پر خضاب لگانا شروع کردیا مگر ان کی داڑھی اس قدر سفید تھی کہ اس پر سیاہی مشکل سے چڑھ رہی تھی۔ آخر کار جب مغرب کے قریب اندھیرے میں ان کو یقین ہوگیا اور ہم نے قسم کھا کر یقین دلایا کہ اب داڑھی بالکل نقلی نہیں معلوم ہوتی اس وقت اس روسیاہ نے خضاب سے ہاتھ اٹھایا اور اب شروع ہوئے دوسرے بناؤ سنگار مختصر یہ کہ رات کے ۸ بجے ہمارا نوشاہ بالکل تیار ہو کر موٹر پر اپنے ساتھیوں کے ساتھ روانہ ہوگیا۔

اب ہم کو شوق سوار ہوا کہ کسی طرح ہم بھی اس بھڑ بھس کے مناظر دیکھتے اور میر صاحب کے سسرال والوں کی یہ کورچشمی بھی دیکھتے کہ جو نظر انتخاب ہم پر پڑی تھی وہ اس کونے کے گدھ پر کیونکر پڑتی ہے۔

بہرحال ہم بھی پیچھے پیچھے روانہ ہوگئے اور اطمینان کے ساتھ اُس وقت وہاں پہنچے جب عقد ہو چکا تھا۔ اس لئے کہ اس قسم کی تقریبوں میں جو غل وشور ہوتا ہے وہ وہاں ہو رہا تھا اور نکاح کے وقت والا سکوت نہ تھا۔

بہرحال میر صاحب کی سسرال میں داخل ہو کر ہم بھی ایک کونے میں آدمیوں کی آڑ میں کھڑے ہوگئے اور ارادہ کر ہی رہے تھے اب دُلہا کی بہاریں دیکھیں گے کہ یکا یک فلک شگاف کڑک دار آواز سنائی دی "یہ شرافت ہے کہ بیٹے کی نسبت دے کر اس کی بجائے آپ چلے آئے ہیں؟"

ہم نے کہا کہ خدا خیر کرے اور ہمارا دل دھک سے رہ گیا۔ خیریت گزری کہ ہم ساتھ نہیں آئے تھے۔ میر صاحب ہمارے ساتھ ہی گلو بند کھولے کھولے اس طرح بیٹھے تھے کہ گویا اپنی عمر صاف صاف بتا رہے ہیں۔

تمام گھر میں ایک کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ میر صاحب کے نہ ہونے والے خسر ایک کوٹھڑی میں بیٹھے ہوئے اس ذلت و رسوائی پر رو رہے تھے جو آج ہوئی تھی مگر ان کے برادر عزیز میر صاحب کو جانے بھی نہیں دیتے تھے کہ ہم تو اپنی ذلت کا انتقام آپ سے لیں گے۔

خدا خدا کر کے لوگوں کے سمجھانے بجھانے سے میر صاحب کو چند گستاخیوں کے ساتھ بخیریت جانے کی اجازت مل گئی اور وہ منہ لٹکائے ہوئے جوابی پوسٹ کارڈ کی طرح واپس ہوئے۔

ہم نے مکان سے نکلتے ہی میر صاحب کو پکڑ لیا کہ آخر ہوا کیا؟

میر صاحب نے ہمارا ہاتھ جھٹک کر کہا "ہوتا کیا، وہی کمبخت خضاب پکڑ لیا گیا۔ اس سے تو استرا پھروا لیتے۔"

شوکت تھانوی اتر پردیش (یوپی) کے مشہور قصبے تھانہ بھون کے رہنے والے تھے۔ ۱۹۰۴ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد محکمہ پولیس میں ملازم تھے۔ کچھ دنوں بعد ان کے والد انسپکٹر جنرل پولیس ہو کر بھوپال چلے گئے۔ شوکت نے بھوپال ہی میں ہوش سنبھالا۔ پھر والد لکھنؤ آگئے۔ کچھ دنوں علی گڑھ میں بھی رہے مگر والد کی وجہ سے تعلیم کو اُدھورا چھوڑ کر معاش کی فکر کرنی پڑی۔ ہندوستان کے کئی مشہور اخباروں سے وابستہ رہے۔ ان میں ہمدم، ہمت ہفت روزہ سرپنچ زیادہ مشہور ہیں۔ اسی ہفتہ وار اخبار نے انہیں مزاح نگار کی حیثیت سے متعارف کرایا۔ ان کے مضامین سودیشی ریل، سودیشی ڈاک وغیرہ اب تک دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔ پاکستان بننے کے بعد کراچی آگئے اور مختلف اخبارات سے وابستہ رہے۔ ریڈیو پاکستان سے ان کا مستقل فیچر "قاضی جی" بہت مقبول ہوا۔ آخری دنوں میں جنگ راولپنڈی ایڈیشن کے ایڈیٹر تھے۔ ۱۹۶۳ء میں انتقال ہوا۔

قندِ شیریں

میں ایک گرمی گزیدہ ہوں

سیّد عارف مصطفیٰ

مختصر لباس کے شائقین کو نوید ہو کہ ان کا پسندیدہ موسم آگیا ہے کیونکہ گرمیوں میں یوں تو بیشمار خرابیاں ہیں لیکن سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ ہم خواجہ صاحب کو وہ دیرینہ دمساز پھولدار کچھا پہنے دیکھتے ہیں کہ جس کے پھولوں کے رنگ اب امتدادِ زمانہ سے محض دھبے سے دکھائی پڑتے ہیں اور جسے وہ عین خطِ اشتعال کی سرحد پہ باندھ کر ہماری بے داغ نیت اور بے انت تابِ نظارہ کو خطرے میں ڈالتے ہیں اور اگر وہ کہیں ذرا ہل ہلا کے ہاتھ اٹھا کے انگڑائی لے بیٹھیں تو کچھا دفعتاً حدودِ برداشت پھلانگتا دِکھتا ہے اور بنیان اوپر کو چڑھ کے ان کی روح فرسا و دانے دار توند کی گولائی دکھاتا ہے، یوں ایک ہی منظرنامے میں دو بڑے لرزہ خیز نظاروں سے نگاہوں، اخلاق اور اعصاب پہ بہت برا اثر پڑتا ہے۔

ویسے گرمی کا عام مردانہ ملبوس جو تھوڑا بہت باقی رہتا ہے اسے بنیان اور شلوار کہتے ہیں اور گرمی جتنی جتنی بڑھتی جاتی ہے، تو بنیان اور شلوار کے پائینچے اتنے ہی اوپر کو مائل پرواز ہوتے جاتے ہیں پھر کسی وقت بنیان تو اڑنچھو ہو جاتی ہے لیکن شلوار کو معاشرہ تھامے رکھتا ہے۔ ہمارے دیہاتوں میں شلواروں کی جگہ دھوتی کا استعمال مجرب ہے جو اندرونی ماحول کافی حد تک ہوادار رکھتی ہے لیکن ہوا کا دباؤ بڑھ جائے تو خود بھی ہوا ہونے کی تیاری پکڑتی ہے، ایسے میں اسے مضبوطی سے پکڑے رکھنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں رہتا ورنہ

سامانِ رسوائی کی نمائش کے امکانات یکا یک بڑھ جانے سے معاشرے میں بے راہ روی بڑھنے کے امکانات بھی دفعتاً خطرناک حد تک بڑھ جاتے ہیں۔

خواجہ کا کہنا ہے کہ موسمِ گرما نہایت عشق دشمن اور کیدو پرور موسم ہے کیونکہ ان دِنوں عموماً بجلی کا بحران رہتا ہے اور لائٹ غائب ہوتے ہی محبوب کے ابا اور بھائی گھر کے باہر آ بیٹھتے ہیں اور گھر کے آس پاس ڈیکے عاشق زار کو دیکھ کے وہ جوشِ غضب سے ''بجلی بھری ہے میرے انگ انگ میں'' کی تصویر بن جاتے ہیں، یوں ان دِنوں جو عاشق منہ سے ہائے ہائے کی بانگِ درا سناتے دیکھے جاتے ہیں، اس کی وجہ ہجر و فراق کا غم کم اور محبوب کے ستمگر اہلِ خانہ کی تابڑ توڑ ضربِ کلیمی زیادہ ہوا کرتی ہے۔

اس موسم میں اپنے اخلاق اور زبان کو مہذب رکھنے کی ایک اہم احتیاطی تدبیر یہ بھی ہے کہ بجلی جاتے ہی اس کی پیدا کار کمپنی کے بارے میں رواں تبصرے سننے سے بچا جائے۔ اس موسم میں ایک عجب سی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ گرما گرما آپا دھاپی مچی ہوتی ہے اور سبھی کو بس اپنی اپنی پڑی ہوتی ہے۔ ہر روز سہ پہر آتے آتے حالت یہ ہو جاتی ہے کہ فرہادِ وقت اپنا طرفہ تیشہ ایک طرف کو ڈالے کوہ ستون کی اوٹ میں ایک سائے میں پڑا پیٹ کھجاتا ہونکتا دِکھتا ہے تو دوسری طرف شیریں بھی فرہاد کی جانب سے کان لپیٹے، ٹانگ کے پھوڑے پہ پلستر باندھے گرمی سے بولائی بولائی غٹا غٹ ستو اور سردائی کے جام لنڈھا رہی ہوتی ہے۔

موسم گرما کے بارے میں جو بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ دراصل کھجلیوں کا موسم ہے جسے حالت سکون میں موجود مہذب لوگ بڑے رکھ رکھاؤ سے خارش کہتے ہیں لیکن جیسے ہی یہ ان کو درپیش ہو جائے، وہ بھی اسے صرف کھجلی کہنے پہ اتر آتے ہیں کیونکہ اس صوتی تاثر سے بھی تھوڑا سا سکون ضرور ملتا ہے۔ بلاشبہ یہ واحد قومی مشغلہ ہے کہ جس سے ملنے والی آسودگی پہ ساری قوم متفق ہے۔ خارش موسم گرما کا وہ عطیہ ہے جو کسی کو کہیں بھی عطا ہو جاتا ہے اور بقدرِ ہمت و کثرتِ نجاست ہر کسی کو تھوڑا بہت ضرور نصیب ہوتا ہے، تاہم بعضے ایسے لوگ، جو یہ

> عقلمند مرد عورت کو یہ بتانے میں لگا رہتا ہے کہ میں تجھے سمجھتا ہوں جبکہ بیوقوف مرد یہ ثابت کرنے میں لگا رہتا ہے۔
> خندہ زن از ڈاکٹر محمد یونس بٹ

سمجھتے ہیں کہ محض نہانے دھونے اور صاف ستھرا رہنے سے اجتناب ہی کھجلی پروری کا باعث ہوتا ہے، تو وہ تو غسلخانے ہی سے اپنا چمڑا کھجاتے برآمد ہوتے ہیں۔

موسم گرما میں جہاں دیکھو جسے دیکھو ہر کوئی کہیں نہ کہیں حسبِ توفیق کھجانے میں مصروف دکھائی دیتا ہے۔ لیلی کھجا رہی ہے مجنوں کھجا رہا ہے۔۔۔ لیکن جو کوئی جس وقت مصروفِ کھجلی ہوتا ہے اک عجب سا سرور اور کیف اس کے چہرے سے ہویدا ہوتا ہے، شاید ویسا ہی کیف جیسا شہنائی بجاتے وقت بسم اللہ خان یا ستار کے تار چھیڑتے سمے روی شنکر کے چہرے پہ نظر آتا ہے، یوں یہ کھجلی اپنی طبعی کیفیت کے لحاظ سے بھلے ہی کوئی سائنسی جواز رکھتی ہو مگر کھجانے کی مشق اسے ذہنی آسودگی کا ذریعہ بنا کر ایک جمالیاتی عمل میں بدل دیتی ہے۔

خیالی کہتے ہیں گرمیوں کا موسم بڑا واہیات ہوتا ہے۔ کراچی میں تو شاید سمندر سے ڈر کے چند ہی دنوں میں شہر چھوڑ دیتا ہے لیکن لاہور میں تو جیسے داتا دربار کے سامنے ملنگوں کے ساتھ ہی پڑ جاتا ہے۔ کراچی کی گرمی بس اسی قدر کو ہوتی ہے کہ ایک قلفی دکھا کے بھگائی جاسکتی ہے مگر اصل گرمی تو اندرون سندھ پڑتی ہے کہ جو اُن کی عقلیں ماؤف کر چھوڑتی ہے اور جس کا ثبوت ہر بار کے انتخابی نتائج میں صاف جھلکتا ہے۔ اِدھر اپنا ملتان تو جیسے ایک بڑے سے تندور کا نام ہے کہ جہاں کے شہری سات ماہ روٹیوں کی طرح اس بڑے تندور کی دیواروں پہ چسپاں ہوئے دِکھتے ہیں۔ یہاں موسم گرما ذرا دیر کو نہیں ستاتا بلکہ رات کو زیادہ چٹاخ پٹاخ ہو جاتا ہے اور جس برے مانس کو جنت نہ ملنے کا پکا یقین ہو، وہ جہنم کی تپش جھیلنے کی پریکٹس کے لیئے مئی جون میں ملتان رہ آئے۔ ہم بھی پہلی بار وہاں جون میں گئے تھے اور صبح صبح پہنچے تھے اور ارادہ چار دن ٹھہرنے کا تھا مگر دوپہر آتے آتے ہم انگارہ بن چکے تھے اور سہ پہر سے بہت پہلے ہی ہم بھوبھل میں جھلستی شکرقندی سے نظر

بھی پہلی بار وہاں جون میں گئے تھے اور صبح صبح پہنچے تھے اور ارادہ چار دن ٹھہرنے کا تھا مگر دوپہر آتے آتے ہم انگارہ بن چکے تھے اور سہ پہر سے بہت پہلے ہی ہم بھوبھل میں جھلستی شکر قندی سے نظر آ رہے تھے اور شام کو ہی اس بھٹی سے یہ بڑبڑاتے ہوئے ٹوک دم ہوئے تھے کہ ''جان ہے تو جہان ہے ورنہ تو مقدر میں ملتان ہے۔''

اس بات میں شبہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ موسمِ گرما کا سب سے زیادہ اثر اخلاق و مزاج پہ پڑتا ہے اور جو منش گرمیوں میں بھی اے سی اور پنکھا بند ہونے کے بعد بھی خوش اخلاق رہ پائے، اسے ہی بھلمناسٹ کی سند ملنی چاہیئے وگرنہ کپکپاتے سرد موسم میں مذاق کرنے بلکہ گرما گرم مذاق کر پانے کی تاب تو اکثر میں ہے لیکن جلتے جھلتے موسم میں محض ٹھنڈا مذاق بھی کر پانا شاذ ہی کسی کے بس میں ہو۔۔۔ جس کسی کو اس موسم میں حقیقی متقی کھوجنا ہو تو وہ کسی تقدس سے لبریز روحانی محفل میں بھی ، گھومنے والے پنکھے کو اچانک اپنی طرف زیادہ موڑ لے اور اگر پھر بھی وہاں کوئی ایک فرد بھی ایسا پائے کہ جو آن کی آن تتیا مرچ بنتا نہ دکھائی دے اور شانت رہ جائے تو پھر بیشک آنکھ بند کر کے اسی کے ہاتھ پہ بیعت کر لے ،مگر شرط یہ ہے کہ وہ تقدس مآب طبعاً دمے اور مزاجاً بلغم کا مارا نہ ہو۔ گرمیاں عروج کو پہنچتے یہ نوبت بھی آ جاتی ہے کہ روزانہ کئی بار نہانا مشکوک نہ رہ جانے کے باوجود بھی زوجہ کا دائرۂ اشتہاء، چھپی بازدودی سرنگوں سے پُر میدان محسوس ہونے لگتا ہے۔۔۔ لائٹ چلی جائے اور بجلی کا متبادل انتظام نہ ہو تو جو خاتون ابھی تھوڑی دیر پہلے پرفیوم کی مہکار سے چمن زار بنی ہوئی تھی، دو تین گھنٹے ہی میں باسی و کھٹے دہی کے کونڈے جیسے بھپکوں کا منبع بن جاتی ہے۔

موسم گرما کی ایک پہچان پہلے کبھی ساون بھادوں بھی ہوا کرتا تھا،لیکن اب بدلتے زمانے میں یہ بھی سیاسی ہو گیا ہے اور کبھی برستا ہے تو کبھی صرف گرج چمک کے ہی رہ جاتا ہے لیکن ہمارے شہر میں تو یہ جب کبھی برستا ہے، آن کی آن میں سڑکوں پہ دریائے کرپشن بہہ نکلتا ہے۔ سڑکیں جوہڑ بن جاتی ہیں اور گلیاں تالاب اور دیکھتے ہی دیکھتے گٹر بھی بہ نکلتے ہیں، ایسے میں کہاں کا کوچہ یار

ایں سعادت بزورِ بازو نیست

(ایک لمرک)

خوشامد ایسا فن ہے، جگ میں جس کو جا وداں دیکھا
اُسی کی موجیں دیکھیں، جس کو اس فن میں رواں دیکھا
ہر اک افسر حبیب اُس کا
ترقی بس نصیب اُس کا
کہ جوتے چاٹنے والا ہمیشہ کامراں دیکھا

نوید ظفر کیانی

اور ''کتھے مرزا یار پھرے''۔ اس وقت پھر یوں ہوتا ہے انجانی راہوں پہ سنسان راتوں میں۔۔۔ ایک مسیحا نکلتا ہے جسے لوگ اینٹھے آ جا کہتے ہیں اور وہ ہاتھوں میں تھامی لکڑی کی طویل پچھی کی بدولت آپ کو ساون بھادوں کی فیوض و برکات کے سیلاب سے اگلے موسم گرما یا اگلی بارش تک کے لیئے امان دلوا دیتا ہے۔ خرابی مگر یہ ہے کہ ڈنڈا کرنے سے خرابی دور کرنے کا یہ فارمولا ایک ادارے کی انسپریشن بنتا ہے اور اس کا عملی اطلاق ہمیں ہر چند برس بعد دیکھنے کو مل جاتا ہے اور ہر بار وہی پرانی غلطی دہراتی نظر آتی ہے یعنی غلط زور لگانے سے ڈنڈا بھی پھنس کے ٹوٹ جاتا ہے اور صاف صفائی کا کام بھی دھرا رہ جاتا ہے اور پھر کئی ساون بھادوں ہمیں یونہی مسائل کے سیلاب میں ڈولتے ڈگمگتے گزارنے پڑ جاتے ہیں۔

گرمی میں غسل سے بڑی نعمت کیا ہو گی کیونکہ موسم سرما میں پانی سے بھری جس بالٹی کی طرف نظر بھر کے دیکھنے سے کپکپی چڑھتی

گرما کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ ہر طرح کے فرد کو نہانے کی توفیق عطا کرتا ہے اور اکثر کو تو بار بار۔۔۔ یوں محض ایک خوشبودار صابن کے بل پہ ایک دوسرے کو برداشت کرنا آسان بناتا ہے، لیکن واضح رہے کہ نہانے کے لیئے لازمی درکار شے صابن نہیں پانی ہے جس کی ناگزیر یا اہمیت اس وقت زیادہ عیاں ہوتی ہے کہ جب شاور کے نیچے موجود نہانے والے نے پورے بدن پہ صابنی جھاگ پہن رکھا ہو اور اس کی آنکھیں مرچیلے بلبلوں کی اوٹ میں ہوں اور پانی غائب ہو جائے پھر شاور خاموش رہتا ہے اور غسلا تا فرد بولتا ہے مگر کچھ ایسا کہ سننے والوں کو صابن لگائے بغیر بھی مرچیں لگ سکتی ہیں، خصوصاً واٹر بورڈ والوں اور ان کے شجرۂ نسب کے چنیدہ افراد کو۔ اس وقت ان کے پورے جسم پہ جتنا جھاگ ہوتا ہے، اس سے کئی گنا زیادہ ان کے منہ سے نکل رہا ہوتا ہے، لیکن کچھ لوگوں کی سوچ زیادہ جدید ہو جانے کی وجہ سے وہ اس مسئلے کا قدیمی حل نہیں نکال پاتے ورنہ تو وہ ایک بالٹی کیوں نہ خرید لاتے اور منہ سے جھاگ کیوں نکالتے، بدن سے ہی کیوں نہ بہا ڈالتے۔

بلاشبہ گرمی کی قہر سامانی کی کافی تلافی اور پوری ڈھارس آم ہیں۔۔۔ اور محض اسی سوغات کی وجہ سے گرمیاں نہایت بری ہو کے بھی خاصی گوارا رہتی ہیں۔۔۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر آم نہ ہوتے تو چلچلاتی گرمیوں سے بلبلاتے ہم اہلِ برصغیر اس موسم میں کیا کرتے؟۔۔۔ یہی تو وہ معجزاتی پھل ہے کہ ایک سیزن کی حد ہی سہی مگر امیری غریبی، رنگ و نسل اور دین دھرم کے سب امتیازات مٹا دیتا ہے۔

بندہ وصاحب ومحتاج وغنی ایک ہوئے
آم کے تھال پہ پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

کیونکہ پلمبر سے وائس چانسلر تک سبھی امبوا کی بور کی مہک سے ہی میعادی باؤلے پن کا شکار ہو جاتے ہیں اور یہ پھل اس قدر عجیب ہے کہ جو اسے بڑے ولولے اور واضح بدتمیزی سے نہ کھائے اسے خوش ذوقی کی داد بھی نہیں ملتی۔

موسم گرما کے رنگوں میں ایک اہم رنگ کسی برہن کے دل کی ہوک کا ہے جو کوئل کے گلے سے کوک بن کے نکلتی ہے اور ہر طرف ہجر کا سوگ اور انتظار کی اداسیاں سی چھا جاتی ہیں۔ امبوا کی ڈاریوں پہ جھلنے میں بیٹھی ناری ساون میں ڈھیروں روپیہ کمانے کو بدلیس گئے اپنے پی کا بڑی بیقراری سے انتظار کرتی ہے کہ شاید اب کے ساون وہ ہولے سے آ جائے اور اسے چپکے چپکے جھلنا جھلانا شروع کر دے لیکن پھر جب کافی دیر کوئی نہیں آتا تو وہ برہا کی ماری آہستہ آہستہ پینگیں لیتی دکھائی دیتی ہے۔ جھولے کی زنجیروں کی کنکناتی، کھڑکھڑاتی آواز بھی یوں سنائی دیتی ہے جیسے وہ بھی کسی یاد میں سسک رہی ہیں اور پھر دفعتاً وہ آس نراس کے بیچ ڈولتی ناری بھی دو چار جھونٹوں ہی میں بیٹھے بیٹھے آپ ہی آپ سسک اٹھتی ہے اور جھولا چھوڑ کے بلکتی سی بھاگ لیتی ہے۔۔۔ پھر سارا ساون جھولا یونہی سونا پڑا رہتا ہے اور یوں لگتا ہے کہ جیسے فریاد کناں ہو، کیا پیا کو معلوم ہی نہیں کہ گوری کے گاؤں ساون کب کا اتر آیا۔۔۔ لیکن وہاں بدلیس بیٹھے بلماء تو نوٹوں کی خوشبو کے آگے بور کی سوندھی مہک اور ایئر کنڈیشنڈ کی خنکی پا کے برگد کی ٹھنڈی میٹھی چھاؤں تو جیسے بھول ہی گئے بلکہ دو تین ہی برس میں ساون بھادوں کے سبھی تیوروں سے انجان ہو گئے۔۔۔ اور اب جب گاؤں کے پیڑوں پہ بیٹھی کوئی کوئل جب کوکتی ہے تبھی آپ ہی آپ گوری کے من اندر بڑے زوروں سے ساون بھادوں اترتا ہے اور پہروں آنچل بھگوتا ہے۔

سیّد عارف مصطفٰی کا تعلق کراچی سے ہے۔ موصوف سیاسی تجزیہ کار اور ایک دردِ دل رکھنے والے بلاگر ہیں۔ خاصی دبنگ شخصیت کے مالک ہیں اور سچ کہنے اور لکھنے میں کسی قسم کے لحاظ کے قائل نہیں۔ ایک بہت اچھے انشاء پرداز ہیں اور فکاہی اندازِ بیان کی وجہ سے خاصے مقبول ہیں۔ اُردو کو پاکستان کی سرکاری زبان بنانے کی تحریک میں ان کی مساعی جمیلہ کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ اُردو طنز و مزاح کے فروغ میں بھی ان کا خاصا ہاتھ ہے، کراچی جیسے آلام زدہ شہر میں فکاہی مجالس برپا کرنا انہیں کا کام ہے۔ ارمغانِ ابتسام کے لئے مستقل لکھنے والوں میں شامل ہیں۔

پروفیسر مجیب ظفر انوار حمیدی

پی ایس ایل کا بخار اور متاثرہ کرکٹیے

ہرطرف سے مایوس ہوکر اب ”خواتین کی سپر لیگ“ کرکٹ ٹیم تیار کی جائے، ہوسکتا ہے وہ گیند بلّے کے علاوہ بھی اپنی آتشِ حسن کے جگر پار انظاروں سے کرکٹ کے میدان میں نیلا کی بجلیاں بھر دیں اور مقابل ٹیمیں اس حسن بلاخیز اور بحرِ حُسن کی موجوں میں غوطہ زن ہوجائیں۔ اگر خواتین کی کرکٹ ٹیم ممکن نہ ہوتو ہیجڑوں کی سپر کرکٹ لیگ ترتیب دی جائے، کم از کم گالیوں، کوسنوں، تالیوں اور بددعاؤں سے ایک آدھ میچ تو ہمارا ہوگا۔

گڑے مُردے

تین سال گزرنے کے بعد پاکستان سپر لیگ کی چمک دمک ایک مقام پر آکر ٹھہر گئی ہے۔ افتتاحی تقریب میں بھی وہی ٹیمیں، وہی کھلاڑی اور وہی فنکار نظر آئیں گے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انتظامیہ کے لیے اس میں کچھ نیا کرنے کے لیے باقی نہیں رہا۔

گزشتہ سال پاکستان سپر لیگ کے دوران دبئی سٹیڈیم شائقین سے مکمل طور پر نہیں بھر سکا تھا۔ پاکستان کرکٹ بورڈ کے سابق چیئرمین نجم سیٹھی نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کیا تھا۔

انہوں نے کہا تھا کہ پہلے ہم تھوڑی بہت مفت ٹکٹیں دے دیتے تھے لیکن متحدہ عرب امارات میں نئے ٹیکس کے نفاذ کے سبب یہ اب ممکن نہیں رہا اور مقامی قوانین کے تحت دس فیصد سے زیادہ مفت ٹکٹیں نہیں دی جاسکتیں۔

نجم سیٹھی کا یہ بھی کہنا تھا کہ ایجنٹس کی بھی حوصلہ افزائی کی گئی لیکن مثبت نتیجہ سامنے نہیں آیا۔

ان کا کہنا تھا کہ اس صورتحال کا سب سے بہتر حل یہی ہو سکتا ہے کہ اس لیگ کو جتنا جلد ممکن ہو سکے پاکستان لایا جائے۔

سابق کپتان اور پی ایس ایل کے برانڈ ایمبیسڈر رمیز راجہ نے بھی گذشتہ سال اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ پاکستان سپر لیگ کا انوکھا پن اب سپاٹ ہوتا نظر آرہا ہے اور اگر اسے دبئی اور شارجہ میں منعقد کرنا ہے تو اس کے لیے بہت زیادہ محنت کرنی ہوگی کیوں کہ مقامی شائقین اب بہت زیادہ کرکٹ دیکھ کر تھک گئے ہیں۔

ایک لطیفہ

کرکٹ میچ ہو رہا تھا۔ شوہر انہماک سے میچ دیکھ رہا تھا۔

بیوی: کون کھیل رہا ہے؟

شوہر: پاکستان۔

بیوی: اوہو۔۔کھلاڑی کونسا ہے؟

شوہر: آفریدی۔

بیوی: شاہد آفریدی؟

شوہر: ہاں بھئی شاہد آفریدی۔

بیوی: اس بیچارے کی صرف بیٹیاں ہی ہیں نا؟

شوہر: پتا نہیں۔

بیوی: میں نے اس کا انٹرویو دیکھا تھا۔ بیٹا نہیں اس کا۔

شوہر: اوکے۔

چند منٹ خاموشی۔

بیوی: اچھا۔ آج انڈیا جیت گیا تو؟

شوہر: نہیں بنگلہ دیش سے میچ ہے۔

بیوی: اوہ۔ بنگلہ دیش پہلے پاکستان کا حصہ تھا ناں؟

شوہر: ہاں بابا۔ پر اب آزاد ملک ہے۔

بیوی: مجھے پتا ہے۔ بنگلہ دیش کا سکور کیا ہے؟

شوہر: اوہو۔ پہلے ہم بیٹنگ کر رہے ہیں۔ وہ فیلڈنگ۔

بیوی: اچھا؟ چلو پاکستان کا سکور بتا دو۔

شوہر: ۱۴۰۔

بیوی: جاوید میاں داد نے کتنے رنز کیے؟

شوہر: وہ ریٹائر ہو چکا ہے۔ اب نہیں کھیلتا۔

بیوی: پھر کون کھیل رہا ہے؟

شوہر: شعیب ہے۔

بیوی: اوہ جس نے ثانیہ مرزا سے شادی کی؟

شوہر: ہاں وہی۔

بیوی: ثانیہ کا ابھی کوئی دوسرا بچہ نہیں ہوا نا؟

شوہر: پتا نہیں۔

پھر چند منٹ خاموشی۔

بیوی: ویسے ثانیہ انڈیا میں رہتی ہے یا پاکستان؟

شوہر: مجھے کیا پتا؟

بیوی: اوہو غصہ کیوں کرتے ہو۔ ایسے ہی پوچھا تھا۔

شوہر: غصہ نہیں۔ بس میرا دھیان میچ میں ہے۔

بیوی: اچھا میچ ہے!!

شوہر: آخری دو اوور رہ گئے ہیں۔

بیوی: میچ والے دن آپ کو کسی چیز کا ہوش نہیں رہتا۔ نہ بیوی کا نہ بچوں کا۔

شوہر: بس آخری اوور ہے۔

بیوی: پھر کیا ہوگا؟

شوہر: پھر بنگلہ دیش کھیلے گا۔

بیوی: مطلب پاکستان فیلڈنگ کرے گا۔

شوہر: ہاں۔ یہ لو پاکستان کی باری ختم۔

بیوی: ٹوٹل سکور کیا ہوا؟

شوہر: ۱۶۸۔

بیوی: ذرا ریموٹ دینا۔

بیوی نے چینل تبدیل کر کے ڈرامہ لگایا۔

شوہر: کونسا ڈرامہ ہے؟

بیوی: دیکھیے میں نے آپ کو میچ میں ڈسٹرب نہیں کیا۔ اب پلیز جب تک ڈرامہ لگا ہے میرا سر مت کھائیے۔ جائیں بچوں کو ذرا پارک میں لے جائیں۔

گڑے مُردے۔۲

پاکستان سپر لیگ کے پاکستان میں نہ ہونے کے سبب فرنچائز مالکان اور پاکستان کرکٹ بورڈ کو بے پناہ اخراجات کا سامنا کرنا پڑا ہے اور ابھی تک یہ لیگ ان کے لیے منافع بخش نہیں بن سکی ہے۔

پاکستان سپر لیگ میں حصہ لینے والی فرنچائز پشاور زلمی کے سربراہ جاوید آفریدی کا کہنا ہے کہ ''اس لیگ نے پاکستان کی کرکٹ کو اس وقت سہارا دیا جب وہ انٹرنیشنل کرکٹ سے محروم تھی۔ پہلی لیگ کی کامیابی ہی اگلے سال پاکستان میں انٹرنیشنل کرکٹ کی بحالی کا سبب بنی۔ اس سال آٹھ میچوں کا پاکستان میں انعقاد ہونا ایک بہت بڑی کامیابی ہے۔''

جاوید آفریدی کا کہنا ہے کہ ''تمام فرنچائز مالکان نے پاکستانی کرکٹ کی خاطر اس لیگ میں سرمایہ کاری کی ہے اور جیسے جیسے یہ لیگ پاکستان آئے گی ٹیکس کے معاملات میں فرنچائزز کے لیے آسانیاں پیدا ہوتی جائیں گی۔ حکومت نے فرنچائز مالکان کی بات سنی ہے اور ٹیکس اصلاحات کیے ہیں جو ایک مثبت قدم ہے۔''

گڑے مُردے۔۳

دو بار پی ایس ایل جیتنے والی اسلام آباد یونائیٹڈ کے سربراہ علی نقوی کا کہنا ہے کہ ''پچھلے تین برسوں کے دوران سب نے اس لیگ کو کامیاب کرنے کے لیے ان تھک محنت کی ہے اب کوشش اس بات کی ہے کہ اگر اس لیگ سے کسی کو بہت زیادہ فائدہ نہیں ہو رہا تو نقصان بھی زیادہ نہ ہو۔''

بدقسمتی کی ابتدا بھی ہمیشہ بدقسمتی سے ہوتی ہے۔ ترانے کے بعد ٹاس بھی ہماری ٹیم ہار گئی۔ جتنا فرق میچ اور میچ کے بارے ہمارے اندازوں میں تھا تقریباً اتنا ہی فرق پچ کنڈیشنز اور کپتان کے لگائے گئے اندازے میں تھا۔ میچ آخر کار شروع ہوا۔ ہماری ٹیم نے بلے بازی شروع کی تو گیند ایسا گھوم رہا تھا کہ کھلاڑیوں کے اوسان خطا ہو گئے۔ پہلے پانچ اوورز تک دونوں کھلاڑی وکٹیں بچانے کی چکر میں رنز نہیں بنا سکے۔ پھر نئے کھلاڑی پچ کنڈیشنز سے ہم آہنگ ہو رہے تھے۔ پھر رنز کرنے لگے تو اوورز ختم ہو گئے۔ عمر اکمل بیچارے کو شاید کسی نے نہیں بتایا تھا کہ میچ اٹھارہ اوورز کا ہے، ورنہ وہ ہمیشہ کی طرح آج بھی اچھا کھیل لیتے۔ بلے بازوں کی غلطیاں اور ایکسٹرا رنز ملا کر ہماری ٹیم کا مجموعی سکور بمشکل ایک سو بیس تک پہنچ گیا۔

انگلینڈ کے مشہور کرکٹر ٹونی گریگ اپنی یادوں کے تذکرے میں پاکستان کے سابق کپتان مشتاق محمد کے بارے میں کہتے

وزیرِ سائنس اینڈ ٹیکنالوجی
محترم فواد چوہدری
نئے پاکستان کے
سلسلے میں سائنس کے ایک
اہم پراجیکٹ پر مصروفِ عمل

ہیں۔ ''ورلڈ سیریز کرکٹ میں وہ میری کپتانی میں کھیل رہا تھا۔ ایک میچ میں مجھے اس کی اشد ضرورت تھی جبکہ اس کی ایڑی میں چوٹ لگی ہوئی تھی۔ وہ شدید تکلیف کی حالت میں تھا اور منہ بسورے ڈریسنگ روم کے آس پاس ٹہل رہا تھا۔ میں نے میچ سے ایک روز قبل اپنے فزیو کو فون کیا اور اس سے پوچھا کہ تم کل مُشی کا علاج کرو گے۔ وہ بڑا سا ٹیکہ اپنے ساتھ لانا جو تمھارے بیگ میں ہوتا ہے۔ چنانچہ اگلے روز مُشی فزیو کے سامنے بیڈ پر لیٹا ہوا تھا اور یہی کہہ رہا تھا کہ وہ اَن فٹ ہے۔ فزیو جب بھی اس کی ایڑی دباتا تو وہ کراہنے لگتا۔

''اب صرف ایک ہی طریقہ ہو سکتا ہے۔'' فزیو نے یہ کہتے ہوئے اپنے بیگ سے کوئی ایک فٹ لمبا ٹیکہ باہر نکالا اور اس طرح لہرایا کہ مُشی اسے دیکھ لے۔ مُشی نے ایک نظر ٹیکے کو دیکھا اور بولا ''اچھا، ٹھیک ہے، میں کھیلنے کی کوشش کرتا ہوں۔ مجھے اب درد نہیں ہو رہا۔''

مجھے لگ رہا تھا کہ وہ یہی کہے گا۔ وہ ایک اچھا ٹیم ممبر، ایک زبردست لڑاکا اور مرد آدمی تھا۔

یادش بخیر کرکٹیات

کرکٹ نہیں... فٹ بال!!

برطانیہ میں ساتواں کرکٹ ورلڈ کپ جاری تھا۔ ایک کے بعد ایک فتوحات سمیٹتی پاکستانی ٹیم کے کھلاڑی ڈریسنگ روم میں خوش گپیوں میں مشغول اور اپنی پُر لطف باتوں سے محفل کو کشتِ زعفران بنائے ہوئے تھے۔ ایسے میں لیگ اسپنر مشتاق احمد فٹ بال کے ساتھ مختلف کرتبوں کا مظاہرہ کرنے میں مصروف نظر آئے۔ وہ فٹ بال کو کبھی دائیں پاؤں کی انگلیوں کی مدد سے اوپر اُچھالتے اور کبھی بال لے کر تھوڑا آگے بڑھاتے، کبھی ڈربل کرتے اور یونہی کھیلتے کھیلتے ان کے ذہن میں نجانے کیا بات آئی کہ انہوں نے ساتھی کھلاڑیوں کو متاثر کرنے کے لیے (کہ میں کرکٹ کے علاوہ فٹ بال بھی بہت اچھی طرح کھیل سکتا ہوں) فٹ بال کو کِک لگا دی۔ بال ہوا میں بلند ہوئی اور زوردار دھماکے کے ساتھ شیشے سے جا ٹکرائی۔ چھن کی آواز آئی اور شیشہ اور ٹیوب لائٹ کرچی کرچی ہو گیا۔ اب صورت حال یہ تھی کہ مشتاق احمد کو اپنی شوخیوں کا خمیازہ ساتھی کھلاڑیوں کے قہقہوں کی صورت میں بھگتنا پڑا۔

کھلاڑیوں کی پہچان میں پریشانی

۱۹۸۳ء کے ورلڈ کپ میں شامل پاکستانی کھلاڑی شاہد محبوب اپنی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ ''ورلڈ کپ میں جو پاکستانی ٹیم حصہ لے رہی تھی۔ اس میں پانچ کھلاڑی ایسے تھے جن کی ڈاڑھی تھی۔ ان میں میرے علاوہ اعجاز فقیہ، وسیم راجا، طاہر نقاش اور راشد خان شامل تھے۔ انگلش کمنٹیٹرز کو پاکستانی کھلاڑیوں کو پہچاننے میں بڑی پریشانی کا سامنا تھا۔ ان کو معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ کون بالنگ کر رہا ہے اور کون کس جگہ فیلڈنگ کر رہا ہے۔ ہم پانچوں میں قدر مشترک یہ تھی کہ تمام ہی بالر تھے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ طاہر نقاش کے خلاف رنز بنتے تو کمنٹیٹرز شاہد محبوب کا نام لے رہے ہوتے۔ پورے ورلڈ کپ کے دوران انگلش کمنٹیٹرز کو یہی مشکلات پیش آئیں۔''

فیلڈ میں جمائیاں

مشہور آف اسپنر توصیف احمد ۱۹۸۷ء کے ورلڈ کپ کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ ''لاہور میں کھیلے جانے والے سیمی فائنل میں آسٹریلیا کے ہاتھوں پاکستانی ٹیم کی شکست کے بعد لاتعداد الزامات لگائے گئے، کیونکہ لاہور اور پاکستان کے لوگ اس غیر یقینی شکست کے لیے تیار نہ تھے۔ کسی نے کہا کھلاڑی ساری رات جاگتے رہے، صبح کیسے کھیل سکتے تھے۔ اس وقت تو ہمارے ملک میں رات کو گیارہ، بارہ بجے سونے کا رواج عام تھا۔ سیمی فائنل کے بعد لاہور میں میرا دوست جاوید آیا اور کہنے لگا کہ رات کو باہر چل کر ہوٹل میں نہاری کھاتے ہیں۔ میں نے اسے منع کیا کہ ہماری شکست کے واقعہ کو چند گھنٹے گزرے ہیں اور لوگ باتیں کریں گے۔ اس لیے آج باہر نہیں جائیں گے۔ جاوید کہنے لگا لوگوں کا سامنا آج بھی کرنا ہے اور کل بھی تو آج ہی کیوں نہ کر لو۔ ہوٹل

پہنچے تو وہاں چار لڑکے بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ ہمیں دیکھ کر کہنے لگے کہ جب ہمارے پلیئر ہی راتوں کو اتنی دیر تک جاگیں گے تو میچ کس طرح جیتیں گے۔ یہ توصیف احمد بھی فیلڈ میں جمائیاں لے رہے تھے۔ مجھے ان کی بات سمجھ میں نہ آسکی۔ بعد میں، میں نے جاوید سے پوچھا کہ یہ لوگ کیا کہہ رہے تھے تو جاوید نے کہا کہ تمھاری جمائی کا ذکر کر رہے تھے کیونکہ ایک بار جب تم کیمرے پر آئے تھے تو تم پورا منہ کھول کر جمائی لے رہے تھے اور ان لوگوں کو باتیں کرنے کا موقع مل گیا۔ جبکہ جمائی لینے کی وجہ شب بیداری نہیں تھی بلکہ وہ دن ہی ہماری ٹیم کے لیے اچھا نہ تھا۔

سر پر انڈے

ہاکی کے کھلاڑی محمد سرور اپنے بچپن کا ایک واقعہ سناتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ گھر والوں نے انھیں بازار سے انڈے لانے کے لیے بھیجا۔ وہ انڈے خرید کر واپس لوٹ رہے تھے کہ گلی میں کھیلتے دوستوں نے روک لیا۔ محمد سرور نے انھیں دھمکی دی کہ اگر مجھے نہ جانے دیا تو سارے انڈے تمھارے سر پر مار کر توڑ دوں گا۔ ایک لڑکا فوراً بولا: ''ہمت ہے تو مار دو۔''

محمد سرور نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، ایک ایک کر کے سارے انڈے لڑکے کے سر پر مار دیے۔ انڈے ٹوٹ چکے تو وہ لڑکا ہنستا ہوا اُٹھا اور بولا۔'' واہ بھئی آج تو سر پر خوب شیمپو لگا ہے۔ نہانے میں بہت مزا آئے گا اور بال بھی روشن و چمک دار ہو جائیں گے۔''

یہ سُن کر محمد سرور کو احساس ہوا کہ وہ اپنا ہی نقصان کر بیٹھے ہیں۔

گوشی

پاکستان کے سابق فاسٹ بالر رانا نوید الحسن اپنے ایک انٹرویو میں کہتے ہیں۔ ''جنوبی افریقا میں چمپئن ٹرافی کھیلی جا رہی تھی۔ ہمارے شہر شیخوپورہ سے بھی لوگ پڑھائی اور بزنس کی غرض سے گئے ہوئے تھے۔ جس کا مجھے علم نہ تھا۔ میں میچ کھیل رہا تھا تو پیچھے سے مجھے رانا، رانا کی آوازیں آرہی تھیں۔ میں نے توجہ نہ دی کہ میچ چل رہا ہے۔ اچانک مجھے آواز آئی ''گوشی۔۔۔'' اِس نام سے مجھے گھر میں پکارا جاتا ہے۔ میں نے پیچھے مُڑ کر دیکھا تو ہمسائے کا لڑکا تھا۔ مجھے بہت اچھا لگا اور جب اوور ختم ہوا تو میں اس سے ملنے بھی گیا۔''

بستر میں کنگرو آسٹریلیا کے مشہور وکٹ کیپر ای ین ہیلی بتاتے ہیں کہ ''میں سوتے میں چلنے کا عادی رہا ہوں۔ ۹۳ء میں آسٹریلیا کی انڈر ۱۹ ٹیم کے ہمراہ انگلینڈ کے دورے پر تھا۔ میں رات کو سویا اور سوتے میں اُٹھ کر چلنے لگا۔ ہماری ٹیم ساؤتھمپٹن میں ٹھہری ہوئی تھی۔ میکڈرمٹ میرا روم میٹ تھا۔ اس نے مجھے چلتے دیکھا تو کافی پریشان ہو گیا کیونکہ میں سو رہا تھا۔ میکڈرمٹ نے مجھے جگانے کی کوشش کی تو مجھے ہوش آگیا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں بستر سے نکل کر سیر کیوں کر رہا تھا تو میں نے اسے بتایا کہ میں خواب دیکھ رہا تھا کہ میرے بستر میں ایک بڑا کنگرو گھس آیا ہے اور میں خوفزدہ ہو کر بستر سے نکل بھاگا۔'' ہم تو یہی کہہ سکتے ہیں کہ آسٹریلیا میں رہنے والوں کے خواب میں کنگرو ہی آ کر ان کی ہوائیاں اُڑا سکتے ہیں۔

جاوید میانداد کی چھلانگیں

بھارت کے خلاف عالمی کپ کے ایک میچ میں جاوید میانداد بلّے بازی کرنے گئے۔ اس دن جاوید میانداد مکمل فٹ نہیں تھے۔ بھارتی وکٹ کیپر کرن مورے مخصوص انداز میں اُچھل اُچھل کر اپیل کیا کرتا تھا۔ اس دن بھی وہ وکٹوں کے پیچھے خوب بول رہا تھا۔ جاوید میانداد کو تنگ کرتا رہا۔ آخر تنگ آ کر جاوید میانداد اپنی خراب حالت کے باوجود 3 مرتبہ اُچھل اُچھل کر اس کے اپیل کرنے کے انداز کی نقل کی تو پورا اسٹیڈیم قہقہوں سے گونج اُٹھا۔ مورے یہ دیکھ کر اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ اسے دوبارہ جاوید میانداد کو تنگ کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اپنی خراب حالت کی وجہ سے جاوید میانداد کو اُچھلنے سے تکلیف تو ہوئی۔ لیکن انھوں نے مورے کو سبق سکھا دیا کہ پورا اسٹیڈیم اس پر ہنسنے لگا۔

مینڈک کھا گئے

پاکستان کے مایہ ناز بالر سرفراز بیتے دنوں کے قصے چھیڑتے

ہوئے کہتے ہیں "۱۹۷۶ء میں دورۂ ویسٹ انڈیز کے دوران ایک ایسا واقعہ پیش آیا جسے میں کبھی نہیں بھلا پایا۔ جمیکا میں رات کے کھانے میں فہرستِ طعام (menu) پیش کی گئی تو اس میں "chickenMountain" کے نام سے بھی ایک ڈش موجود تھی۔ میں اس ڈش کی حقیقت سے آگاہ تھا۔ مگر وہ جونیئر کھلاڑی مثلاً جاوید میانداد اور ہارون الرشید وغیرہ جو پہلی بار ویسٹ انڈیز کا دورہ کر رہے تھے۔ انھوں نے سمجھا کہ ماؤنٹین چکن تو کوئی کافی بڑی ڈش ہوگی اور اس کا آرڈر دے دیا۔ جب وہ سیر ہو کر کھا چکے تو میں نے ان سے کہا کہ جانتے ہو کہ تم لوگوں نے کیا کھایا ہے؟ وہ حیرت سے مجھے تکنے لگے تو میں نے بتایا کہ ماؤنٹین چکن تو مینڈک ہوتا ہے اور یہ ادھر کی خاص ڈش ہے۔ اس پر وہ سمجھے کہ شاید میں مذاق کر رہا ہوں۔ اپنی تسلی کے لیے انہوں نے ویٹر کو بلایا تو اس نے میری بات کی تصدیق کی اور انہیں بتایا کہ ماؤنٹین چکن بہت بڑا مینڈک ہوتا ہے۔ یہ جان کر جاوید میانداد اور ہارون الرشید کی طبیعت خراب ہونا شروع ہوگئی اور وہ باتھ روم میں جا کر اُلٹیاں کرنے لگے۔

سر! ایک لڑکا غائب ہے

ویسٹ انڈیز کو دو دفعہ عالمی چیمپئن بنوانے والے کرکٹ کے عظیم کھلاڑی کلائیو لائیڈ پہلے عالمی کپ کا ایک واقعہ سناتے ہوئے کہتے ہیں۔

"بین الاقوامی ایک روزہ عالمی کپ ۱۹۷۵ء میں شرکت کے لیے جب ہم انگلستان پہنچے تو وہاں ہوائی اڈے پر ہمارے ساتھ ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ کسٹمز اور دیگر امیگریشن کے معاملات سے فارغ ہونے کے بعد جب ہماری ۱۵ رکنی ٹیم ہوائی اڈے سے باہر آئی تو وہاں عالمی کپ انتظامیہ نے ہمارا خیر مقدم کیا اور ہمیں ہوٹل پہنچانے کے لیے ایک وین میں سوار کرا دیا گیا۔ وین کے چلنے سے قبل ہمارے ٹیم منیجر نے ہمارے ایک ساتھی بوائس جو کہ ٹیم کے اسسٹنٹ منیجر اور خزانچی کی ذمہ داریاں بھی نبھا رہے تھے، سے کہا کہ لڑکے گن لو، سب وین میں سوار ہو گئے ہیں؟ بوائس نے لڑکے گننا شروع کیے۔ اسی دوران ڈرائیور وین چلاتے ہوئے سڑک پر لے آیا۔ ہم سب آرام وسکون سے ایک دوسرے سے باتوں میں مصروف تھے کہ اچانک بوائس چلا اُٹھے "سٹاپ، پلیز سٹاپ دی بس۔" بوائس خوفناک انداز میں چلائے تو ڈرائیور نے گھبرا کر بریک پر پاؤں رکھ دیا۔ ہم سب حیرت سے بوائس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"سر کوئی لڑکا غائب ہے؟" بوائس نے ٹیم منیجر کو مخاطب کیا۔

اب ہم سب گننے لگے اور حیرت انگیز طور پر لڑکے پورے ۱۵ تھے یعنی ٹیم کی تعداد پوری تھی۔ ٹیم منیجر بوائس کی بے وقوفی بھانپ گئے اور پوچھا۔ "کون سا لڑکا غائب ہے؟"

بوائس بولا "سر یقیناً ایک غائب ہے، جولین بھی ہے، لائیڈ بھی ہے اور کنگ بھی۔۔۔ مگر پھر بھی ایک غائب ہے۔"

اس دوران روہن کنہائی جو ہمارے سب سے سنئیر رکن تھے۔ اُٹھ کر بوائس کے پاس گئے اور اس کا کان پکڑ کر بولے "پندرہواں لڑکا یہ ہے۔"

دراصل بوائس گنتی کرتے ہوئے اپنا شمار کرنا بھول جاتے تھے۔ سارے رستے سب نے اُس کا خوب مذاق اُڑایا۔

دوستو! کیسا لگا "کرکٹیاتی بخار؟"

آپ سب کو ماہِ رمضان اور عید الفطر ۲۰۱۹ء بہت بہت مبارک ہو، آمین!

> کراچی سے تعلق رکھنے والے پروفیسر ڈاکٹر مجیب ظفر انوار حمیدی اُردو کے ایک بہت بڑے ادیب جناب انوار (عکیک) کے بہت بڑے صاحبزادے ہیں۔ یہ بچوں کے معروف ادیب ہیں۔ اب تک اِنہوں نے بچوں کے لئے سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں کہانیاں لکھ لی ہیں اور مسلسل لکھ رہے ہیں۔ پروفیسر صاحب کے اندازِ بیان کا طرۂ امتیاز شگفتگی اور بیساختگی ہے۔ خصوصاً قلمی خاکے لکھنے میں تو ان کا جواب ہی نہیں۔ حالات و واقعات کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ تصویری بنا کر رکھ دیتے ہیں۔ "ارمغانِ ابتسام" کو فخر حاصل ہے کہ یہ اس کے لئے تسلسل سے لکھ رہے ہیں۔

قندِ شیریں

چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

ابن ریاض

چائے کو کون نہیں جانتا۔ مشرق سے لے کر مغرب تک ہر دوسرا شخص اس کے عشق میں ڈوبا ہوا ہے اور اس میں رنگ و نسل، پیر و جوان اور مرد و زن کی تخصیص نہیں۔ انہیں خصوصیات کی بنا پر چائے کے عاشق اسے ''اشرف المشروبات'' بھی کہتے ہیں۔

چائے سے محبت کا اندازہ اس بات سے لگا دیں کہ خیبر پختون خواہ کی گزشتہ حکومت پانچ سال میں دو ارب کی چائے پی گئی اور ڈکار بھی نہ مارا (ویسے چائے سے ڈکار آتے بھی نہیں ہیں)۔ یوں بھی ہم نے دیکھا ہے کہ اکثر سرکاری ملازمین تو دفتر جاتے ہی چائے پینے اور اخبار پڑھنے کے لئے ہیں۔ گھر میں اتنی چائے مانگنے پر بیگم نے وہ سنائی ہیں کہ اُنہیں چھٹی کا دودھ یاد آ جائے گا۔ دودھ تو چھٹی کا مل جاتا ہے مگر پتی نہیں ملتی کہ چائے بن سکے۔ اگر ہم بطور قوم چائے ہی آدھی کر دیں تو ملک کا کافی زرِ مبادلہ بچایا جا سکتا ہے۔

بھینسوں کے بعد حکومت کا اگلا ہدف چائے ہونی چاہیے اور عوام کو حکومت بتائے کہ پچھلی حکومتیں چائے کی کیسی عیاشی کر گئی ہیں۔ حکومت کو یہ بھی بتانا چاہیے کہ انہیں بھینسوں کا دودھ چائے میں بھی استعمال ہوتا تھا گویا کرپشن پر کرپشن۔

چائے کے عاشقین میں ہمارا بھی شمار ہے۔ ہمارے لئے پراٹھا اور چائے پٹرول کا کام کرتے ہیں یعنی ان کے بغیر ہماری صبح ہو جائے تو ہمیں اپنا آپ بیگانہ سا محسوس ہوتا ہے۔ چائے کے ہم بچپن سے ہی شوقین ہیں۔ صبح شام چائے ہماری ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ بھی مل جائے تو انکار کر کے کفرانِ نعمت کے مرتکب نہیں ہوتے۔

کچھ لوگ سارا دن چائے پیتے ہیں۔ پندرہ بیس پیالیاں تو ان کے لئے عام بات ہے۔ ایسے لوگوں کی شریانوں میں چائے خون بن کر دوڑتی ہے اور اگر ان کا خون کا گروپ معلوم کیا جائے تو وہ ''ٹی پازیٹو'' نکلتا ہے۔

بچپن میں ہمیں دادی ایک مرتبہ جنت کے متعلق بتا رہی تھیں کہ وہاں شہد ہوگا، ہر قسم کے لذیذ پھل ہوں گے اور دودھ کی نہریں جاری ہوں گی۔ ہم نے بے ساختہ پوچھا کہ دادی جنت میں چائے ملے گی؟ دادی نے کیا جواب دیا یہ یاد نہیں مگر جب بھی بات ہماری چائے پر آئے تو ہمیں یہ جملہ یاد کروا کر شرمندہ کرنے کی ناکام کوشش کی جاتی ہے۔

چائے بھی عجیب چیز ہے۔ اگر کسی کو ٹھنڈ لگ رہی ہے تو چائے گرم کر دے گی جبکہ گرمی کی صورت میں ٹھنڈا کرنا اسی مشروب کا

کام ہے۔ اگر افسردہ ہیں تو آپ کا موڈ ٹھیک کردے گی اور اگر کسی معاملے میں آپ بہت زیادہ جوشیلے پن کا مظاہرہ کر رہے ہیں تو آپ کو پرسکون کردے گی۔

چائے کے بنیادی اجزا پتی اور دودھ ہیں۔ سعودی عرب میں چائے بغیر دودھ کے بھی ہوتی ہے۔ ہمیں تو وہ پتی اور ابلا ہوا پانی ہی محسوس ہوتا ہے سو ہم نے کبھی اس پر نظرِ التفات نہیں کی۔ دودھ کے بغیر چائے ایسی ہی ہے جیسے مفتی منیب الرحمان کے بغیر رویتِ ہلال کمیٹی۔

چائے کی کچھ اقسام بھی ہیں۔ جیسے کشمیری چائے۔ یہ کشمیر کی طرح بہت خوبصورت اور لذیذ ہوتی ہے لیکن جیسے کشمیری پاکستانیوں سے عام نہیں مل سکتے ایسے ہی پاکستانیوں کو کشمیری چائے بھی عام نہیں ملتی۔ اس کے علاوہ سبز چائے بھی ہوتی ہے جس کا فائدہ یہ ہے کہ اس کے ساتھ بسکٹ کیک رکھنے کا رواج نہیں ہے سو کفایت شعار گھرانے اس کو زیادہ استعمال کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ٹی بیگز والی چائے بھی ہوتی ہے۔ وہ بن جلدی جاتی ہے مگر ذائقہ میں پتیلے میں بننے والی چائے کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ کچھ لوگ دودھ زیادہ پسند کرتے ہیں تو کچھ کو زیادہ پتی والی چائے مرغوب ہوتی ہے۔ ہمارا شمار آخر الذکر میں ہے۔ جب تک چائے کڑک نہ ہو پینے میں مزہ نہیں آتا۔

چائے ایسا مشروب ہے جو ہر کوئی بنا سکتا ہے حتیٰ کہ ہم بھی۔ تاہم ہمارا مشورہ ہے کہ سست لوگوں کو کبھی اچھی چائے نہیں بنانی چاہیے، اگر اچھی بن جائے تو خود ہی ساری پی لیں۔ اگر گزارے لائق بنے تو سب میں تقسیم کر دیں۔ اچھی چائے بنانے کی صورت میں گھر والے چائے بنانا آپ کی ذمہ داری میں شامل کر دیں گیا اور دن میں کئی مرتبہ یہ فریضہ آپ کو سرانجام دینا پڑے گا۔

ایک مرتبہ ہمارے گھر ایک صاحب آئے۔ چائے بنانے کی ذمہ داری گھر والوں نے ہم پر ڈالی۔ ہم نے سرِ تسلیم خم کیا۔ چائے بنا کے پیش کی تو پینے والوں نے پہلا گھونٹ بھرتے ہی چائے رکھ دی۔ ہم نے پوچھا کہ کیا ہوا تو کہا کہ خود پی کر دیکھیں۔ ہم نے

ایک گھونٹ بھرا تو ہمارے پاس بھی چائے رکھنے کے علاوہ کوئی راستہ نہ تھا کہ ہم نے چائے میں چینی کی جگہ کئی چمچے نمک ڈال دیا تھا۔ اس کے بعد گھر والوں نے ہمیں چائے بنانے کی زحمت نہیں دی۔

چائے ہمارے ہاں انگریز لایا تھا۔ اس سے پہلے برصغیر کے لوگ اس سے ناآشنا تھے۔ لسی پی کر دن میں بھی سوئے رہتے تھے۔ اب رات میں بھی جاگتے ہیں۔ ہم اس بات کو نہیں مانتے۔ ہم تو چائے پی کر فوراً سو سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی چائے کے متعلق کچھ غلط فہمیاں ہیں۔ کچھ کہتے ہیں کہ چائے پینے سے رنگ کالا ہو جاتا ہے اور پھر رشتہ نہیں ملتا۔ ہمارا تو آج تک رنگ کالا نہیں ہوا۔ یہ تصویر میں جو آپ کو دکھائی دے رہا دراصل یہ تصویر اندھیرے میں لی گئی ہے۔

چائے پینے کا کچھ لوگوں کو اپنا انداز ہوتا ہے۔ وہ چائے کے ہر گھونٹ کے ساتھ سڑ سڑ کی آوازیں نکالتے ہیں۔ یہ آوازیں بعض لوگ تو برداشت کر لیتے ہیں اور بعض کی سماعتوں پر یہ ناگوار ناگوار گزرتی ہیں اور وہ اس کا اظہار بھی کر دیتے ہیں۔ اب چائے پینے والے کوشش تو کرتے ہیں کہ آواز نہ نکالیں مگر ان کی پھر حالت ایسی ہو جاتی ہے جیسی کسی شاعر نے نئی غزل لکھی ہو اور اسے وہ غزل سنانے سے منع کر دیا جائے۔ پھر کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو تنگ ہونے والوں کو مزید تنگ کرنے کے لئے جان بوجھ کر ایسی آوازیں نکالتے ہیں۔ ہماری ہمشیرہ کو بھی بچپن میں ایسی آوازیں بہت بری لگتی تھیں۔ سو ایک مرتبہ اسے چڑانے کے لئے ہمارے نانا ابو اور ماموں آمنے سامنے بیٹھے تھے چائے پیتے ہوئے سڑ کی آوازیں دانستہ نکال رہے تھے۔ مقصد ہمشیرہ کو تنگ کرنا تھا۔ ہماری ہمشیرہ کے چہرے کے زاویے اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ وہ اس صورتحال سے بالکل خوش نہیں ہے مگر چونکہ دونوں بڑے ہیں تو کچھ کہنے کی پوزیشن میں بھی نہیں تھی۔ سو جب وہ روہانسی ہو گئی۔ نانا اور ماموں دونوں اپنی منصوبہ بندی کی کامیابی پر بے اختیار ہنسے تو ان کے منہ سے نکلی چائے ایک دوسرے کے کپڑوں پر جا گری۔ اب دونوں کو اپنے کپڑوں کی پڑ گئی۔ پانی اور نمک سے داغ دھوئے اور پھر کھسیانے ہو کر چائے پینے لگے جبکہ اب ہماری ہمشیرہ کی باری تھی کھلکھلانے کی۔

ابنِ ریاض صاحب کا اصل نام "عمران احمد اعوان" ہے۔ پیشہ صحافت ہے۔ "انویسٹیگیٹو کونسل آف کالمسٹ" کے چیف آرگنائزر ہیں۔ "شگوفۂ سحر" کے نام سے کالم نگاری کرتے ہیں۔ ان کے کالم مختلف اخباروں اور جرائد میں تسلسل سے شائع ہوتے ہیں۔ اندازِ تحریر خاصا شگفتہ اور برجستہ ہے۔ سیاسی و سماجی تجزیہ نگاری ان کا میدان ہے۔ ابنِ انشاء سے متاثر ہیں اور نثر نگاری میں اُنہی کے اُسلوب کی پیروی کرتے ہیں۔ "ارمغانِ ابتسام" میں یہ ان کی دوسری تحریر ہے۔

ملکہ وکٹوریہ یا اس کی اولاد سے نیکی کی توقع اور وہ بھی ایک پاکستانی کے حق میں 'سراسر عبث ہے۔ مگر اللہ چاہے تو سب سے بڑی نیکی کی توفیق سب سے بڑے گنہگار کو دے سکتا ہے۔ چنانچہ ایک روز توفیق خدا نے وکٹوریہ کی پڑپوتی کو بخش دی اور ہمیں یوں پتہ چلا کہ اچانک ملکہ الزبتھ کا نمائندہ دست بستہ حاضر خدمت ہوا اور پچھلے گناہوں کی معافی مانگنے کے بعد عرض پرداز ہوا کہ اگر ہم تین ماہ کے لیے حکومت برطانیہ کو شرف میزبانی بخش کر ان کے ملک کا دورہ کریں تو موصوفہ بڑی ممنون ہوں گی۔ ہمیں اس دعوت سے سرور تو فوری طور پر آیا لیکن دعوت کے جاری ہوتے ہی اس پر جھپٹ پڑنا ایک آزاد پاکستانی کے شایانِ شان نہ تھا۔ چنانچہ ایک باوقار شکریہ ادا کیا اور دعوت بھی 'اصولاً' قبول کر لی لیکن جیسا کہ باقی سربراہان مملکت کا دستور ہے کہ اپنے ہم عصروں کو دعوت تو قبول کر لیتے ہیں مگر تاریخ کا تعین بعد میں ہوتا رہتا ہے ہم نے بھی تاریخ دورہ کو مستقبل کی کسی شبھ گھڑی تک اٹھا رکھا اور ملکہ کا نمائندہ دعائیں دیتا رخصت ہو گیا۔

بسلامت روی از کرنل محمد خان

افطاری سے ایک گھنٹہ پہلے

تاج رحیم

اللہ میاں کو اچھا بھلا پتہ تھا کہ مسلمان بڑا ہی عاجز اور کمزور انسان ہے، اگر تھوڑا سا رحم فرما لیتا۔ روزوں کا بوجھ اس کے سر پر نہ ڈالتا تو یہ بڑے سکون میں ہوتا مگر دنیا کا اصول ہے کہ جو کمزور ہو سارا بیگار اُسی کے سر۔ مسلمان سب کچھ برداشت کر سکتا ہے مگر بھوک برداشت کرنا اس کے بس میں نہیں۔ چند گھنٹے کی بات ہوتی تو معاملہ آسان تھا مگر پورے اٹھارہ گھنٹے کا روزہ! خدا کی پناہ اُوپر سے دوزخ کی گرمی پھر اس کے اُوپر پاکستان میں بجلی کی لوڈ شیڈنگ۔ یہ روزہ تو نہ ہوا بلکہ ڈبل سوپر روزہ ہوا۔

اٹھارہ گھنٹے کے لئے کھانا پینا بند۔ باقی بچے چھ گھنٹے۔ تو یہ چھ گھنٹے مسلمان کیلئے عیش و عشرت کا ٹائم ہے۔ جتنا کھا پی سکتا ہے کھا پی لے مگر ساتھ عبادت بھی نہ بھولے۔ کئی کئی رکعت نفل اور پھر بیس رکعت تراویح بھی لازمی ہے۔ ذکر و اذکار کیلئے نہایت موزوں وقت ہے۔ ان چھ گھنٹوں میں جو دعا مانگی جائے اس کی قبولیت کے چانسز زیادہ ہیں۔ ان چھ گھنٹوں میں سے اگر چند منٹ بچ جائیں تو اس میں جی بھر کر نیند پوری کر لیں کیونکہ صحت کے لئے نیند بھی ضروری ہے اور صبح کام پر بھی جانا ہے۔ اگر ایسا نہ کیا تو افطاری کا دسترخوان خالی خالی ہوگا اور افطاری کا

مزہ نہیں آئے گا۔

یہ گرمیوں کے روزے بڑے لمبے ہوتے ہیں۔ کتنا اچھا ہوتا اگر کرسمس کی طرح روزے بھی دسمبر میں ہوتے اور جون میں نہ آتے۔ عیسائی عقلمند ہیں، وہ اپنا حساب سورج کے ساتھ رکھتے ہیں۔ سورج اپنی جگہ سے نہیں ہلتا بلکہ زمین اس کے گرد گھومتی ہے۔ مسلمان چاند کا عاشق ہے اور چاند زمین کے گرد گھومتا ہے۔ اور زمین کا محتاج ہے۔ چھوڑیئے اس بحث کو۔ یہ سائینس کی باتیں ہیں۔ ہم اس بحث میں نہیں پڑتے۔ مولوی جانے، ان کی سائینس جانے۔

پورے دن روزہ قائم رکھنا کوئی ایسا مشکل کام نہیں مگر افطاری تک آخری گھنٹہ پورے دن سے زیادہ طویل اور مشکل ہوتا ہے۔ یہی گھنٹہ ہے جس میں بڑے بڑے پکے روزہ داروں کی کھوپڑی اپنا بیلنس برقرار نہیں رکھ پاتی۔ یہ سمجھنے کے لئے ایک مثالی روزہ دار فیملی کے گھر آخری گھنٹہ گزارنے چلتے ہیں۔

اس فیملی میں پانچ افراد ہیں۔ میاں بیوی، اٹھارہ سال کا جوان بیٹا، بارہ سال کی ایک بیٹی اور نو سال کا چھوٹا بیٹا۔

وقت: افطاری میں ایک گھنٹہ باقی ہے۔

خاتون خانہ کچن میں کھانا پکانے میں مصروف ہے اور گھر کے باقی لوگ سجے سجائے دستر خوان کے گرد بیٹھے ہیں۔

شوہر: (بگڑے موڈ میں بیوی کو مخاطب کرکے) پورا دن گزر جاتا ہے مگر تمہارا یہ کھانا پکانا ختم نہیں ہو پاتا۔ لگتا ہے آج بھی خشک پانی کے ساتھ روزہ کھولنا پڑے گا۔

بیوی: یہ وقت ہوتے ہی بھوک سے تمہاری آنکھوں پر پردہ پڑ جاتا ہے۔ تمہارے سامنے دستر خوان رنگارنگ کھانوں سے سجا پڑا ہے۔ خدا کا خوف نہیں اور صبر نہیں تو کسی نے تمہارا ہاتھ نہیں روکا ہے۔ ٹوٹ پڑو کھانے پر۔ تم جانو تمہارا خدا جانے۔

شوہر: خواہ مخواہ تمہیں آگ لگی رہتی ہے۔ میں نے کہا کیا ہے، اپنے ہونٹ سی لوں؟

بیوی: تمہارے اس کھانے اور پکانے نے میری کمر دوہری کردی ہے۔ اوپر سے تمہارے یہ جلے کٹے طعنے۔ مجھ سے اور برداشت نہیں ہوتا، لے آؤ کوئی اور اپنے لئے جو سارا دن کچن میں کھڑی رہے اور تمہاری یہ جلی کٹی باتیں بھی برداشت کرے۔

خاوند: ہاں ہاں لے آؤں گا، تیرا جگر ٹھنڈا کرنے کو۔ ذرا صبر کرلو یہ روزے گزر جانے دو پھر دیکھنا، کیا کرتا ہوں۔

بیٹی: (انتہائی بے زاری کے ساتھ) بس افطاری میں یہ آخری گھنٹہ تمہارے لعن طعن کے لئے ہوتا ہے۔ کوئی دن نہیں گزرا کہ ہماری افطاری سکون کے ساتھ ہو۔

ماں: چپ کرو تم سے کس نے پوچھا ہے۔ گھر کے کسی کام کاج کو ہاتھ لگاتی نہیں ہو۔ اس منحوس ناول کے ساتھ سارا دن بستر پر لیٹ کر گزارتی ہو۔ تیار کھانے کے لئے اُٹھ جاتی ہو، جیسے میں تمہارے باپ کی نوکر لگی ہوں۔

بڑا بیٹا غصے میں آکر دستر خوان سے اٹھ کر یہ کہہ کر باہر کو چل

بڑا بیٹا غصے میں آ کر دستر خوان سے اٹھ کر یہ کہہ کر باہر کو چل پڑتا ہے۔ ''آپ لوگوں نے تو افطاری کے وقت یہ شغل اپنا لیا ہے۔ لگتا ہے اس آخری گھنٹے میں آپ لوگوں پر پاگل پن کا دورہ پڑ جاتا ہے۔ مجھے بھی اپنے ساتھ پاگل کر دیا ہے۔ جا رہا ہوں شیر خان کے ہوٹل سکون سے افطاری کرنے۔

باپ: (بیٹے سے) جاؤ جاؤ ہوٹل کے مسالوں کا چسکہ پڑا ہوا ہے۔ ماں کے ہاتھ کے پکے کھانوں میں تمہیں وہ مزہ کہاں ملتا ہے۔

ماں: (دوڑ کر بیٹے کے راستے میں کھڑی ہو جاتی ہے) کہاں چلا ہے میرا بچہ۔ دفع کرو شیر خان کے ہوٹل کو۔ آج ایسے مزیدار اور گرم گرم پکوڑے بنائے ہیں کہ۔۔۔

باپ: (خود سے) بیٹے کے لئے گرم گرم پکوڑے اور ہمارے لئے خشک روٹی۔

بیوی: (شوہر سے) تمہاری ہوس تو کبھی پوری نہیں ہوتی۔

چھوٹا بیٹا باہر سے دوڑتا ہوا آتا ہے۔ ''اللہ اکبر۔ مولوی نے اذان دے دی۔ روزے کھول لو۔''

باپ: (چھوٹے بیٹے سے) دفع ہو جاؤ مولوی کی اولاد۔ شور مچا رکھا ہے۔

بیوی: اب پتہ لگ گیا کہ یہ تمہاری اولاد نہیں، مولوی کی اولاد ہے؟

شوہر: یا اللہ! اس عورت کا میں کیا کروں۔

اچانک مسجد سے اذان کی آواز آتی ہے۔ سب ایک دم خاموش ہو جاتے ہیں۔ پھر دستر خوان پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ اور اگلا آدھا گھنٹہ خاموشی کے ساتھ کھانے میں یوں مصروف ہو جاتے ہیں۔ جیسے ایک دوسرے سے اجنبی ہوتے ہیں۔ اور جب پیٹ بھر جاتے ہیں تو شوہر صاحب الحمد اللہ کے ساتھ ایک ڈکار لیتے ہیں اور پھر بیٹھے بیٹھے کھسک کر دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں اور آنکھیں بند کر لیتے ہیں کہ بیوی کی آواز آتی ہے ''جاگو۔ پیر مت پھیلاؤ۔ اٹھ کر نماز پڑھنے مسجد جاؤ۔''

شوہر: شیرن کی ماں! اللہ گواہ ہے آج بہت تھک گیا ہوں نماز پڑھنے کی ہمت بھی نہیں۔

بیوی: نماز کے لئے تو تم ہر رات تھکے ہوتے ہو۔ بیس روزے گزر گئے اور تم ایک تراویح پڑھنے نہیں گئے۔

بڑا لڑکا یہ کہتے ہوئے باہر چل پڑتا ہے کہ ذرا تازہ ہوا کھانے واک کر لے اور گلی کی نکڑ والی دکان پر سگریٹ لینے کھڑا ہو گیا کہ افطاری مکمل کر لے۔

آیئے سب مل کر اللہ سے درخواست کریں کہ روزے کے دن کے آخری اور مشکل گھنٹے میں کچھ آسانیاں پیدا کر دے۔

بڑی سوچ بچار اور تحقیق کے بعد یہ تجویز ذہن میں آئی ہے کہ افطار کے ٹائم میں تو کوئی تبدیلی نہیں کر سکتے کیونکہ مولوی صاحب نے تو اپنے مقررہ وقت پر اذان دینا ہے۔ اس مسئلے میں کچھ کہنا تو شہد کی مکھیوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنا ہے۔ احتیاط لازمی ہے۔ اللہ سے یوں درخواست کرنا مناسب رہے گا کہ اذان سے ایک گھنٹہ پہلے تھوڑی مقدار میں کھانے پینے کی اجازت مل جائے۔ فائدہ یہ ہوگا کہ بھوک کے مارے پاگل پن سے بچ جائیں گے اور بھوکے بٹیر کی مانند گھر میں لڑنے جھگڑنے سے بچ جائیں گے اور پھر گھنٹہ بعد اذان کے ساتھ کھجور، پکوڑوں، سموسوں اور مٹھائی کے ساتھ روزہ افطار بھی کر لیں گے۔ یوں دین و دنیا دونوں سلامت رہ جائیں گے۔

تاج رحیم صاحب کا تعلق پشاور سے ہے تاہم فی الوقت وہ انگلینڈ میں مقیم ہیں۔ پشتو، ہندکو اور اُردو کے خوبصورت اور منجھے ہوئے ادیب ہیں۔ پشتو میں ان کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ پشتو ادب کے شہ پاروں کو اردو میں منتقل کرنے کا کام بھی خاصی دلجمعی سے سر انجام دے رہے ہیں، جن میں مزاح پارے بھی شامل ہیں۔ تاج رحیم صاحب کا اندازِ تحریر خاصا شستہ اور برجستہ ہے۔ مشکل سے مشکل بات کو کمال سادگی سے بیان کر لینا اُنہیں کا خاصا ہے۔ مزاح نگاری میں اُن کے ہاں موضوعات میں بھی خاصا تنوع پایا جاتا ہے، جس سے پڑھنے والوں کو تحریر میں تازگی کا احساس ہوتا ہے۔

ڈاکٹر امواج الساحل

الفاظ کی آنکھ مچولی

الفاظ سے ہی بچے کی زبان بنتی ہے، جس سے وہ اپنا مافی الضمیر واضح کرسکتا ہے اور اپنی ضروریات ماں باپ کو بیان کرسکتا ہے، یہ بھی ایک نعمت خداداد ہے یا مصائب کی گٹھری، جس کے ذریعے وہ معاشرے سے رابطہ رکھ سکتا ہے۔ مگر میرے لئے الفاظ کا سفر ایک عقدۂ لاینحل تھا جس کا ادراک ناممکن تھا، اور جس کی تہہ تک پہنچتے پہنچتے دل لہولہان ہو جاتا۔ مجھے کہا کچھ جاتا کچھ اور میں سمجھتی کچھ اور، کبھی کبھی کرتی کچھ اور، جس کے نتیجے میں اکثر مار کھانی پڑتی۔

سب سے پہلے جو میں نے امی کو صدمہ دیا، وہ تھا قاعدہ پھاڑ ڈالنے کا، وہ کہتیں یہ لو پڑھو میں سمجھتی، کہہ رہی ہیں ''پھاڑو!'' اور قاعدے کے دو ٹکڑے کرکے کہتی ''یہ لو!''

تین سال کی عمر میں میں اتنا ہی فلسفہ بگھار سکتی تھی، سو بگھارتی رہی۔ انتہائی پریشانی کے عالم میں امی اور قاعدہ منگواتیں، جس کا وہی حشر ہوتا جو پہلے والے کا ہو چکا ہوتا۔ ابو سے شکایت لگائی جاتی جو سادگی سے کہتے ''کوئی بات نہیں بچے اکثر ایسی حرکتیں کرتے ہیں، تم دیکھنا ایک دن بہت پڑھے گی۔''

امی انتہائی مایوسی کے عالم میں کہتیں ''مجھے تو لگتا ہے کہ یہ ان پڑھ ہی رہے گی۔''

مگر ابو شہر سے اور قاعدہ منگوا دیتے۔ وہ محکمۂ انہار میں کسی ڈیم پر اوورسیر تھے۔ نیا نیا پاکستان بنا تھا،

تمام وابستگانِ ارمغانِ ابتسام کو عید مبارک

لوگوں کو کھانے پینے کے لالے پڑے ہوئے تھے کس کو بچے لکھانے پڑھانے کی عیاشی میسر تھی مگر ابو کو تعلیم کا شوق تھا۔ وہ مجھے پڑھانے پر بضد تھے۔ اسی کھینچا تانی میں دو سال گزر گئے، پھر نہ جانے کس کے سمجھانے پر دماغ شریف میں یہ بات سما پائی کہ پڑھنے اور پھاڑنے میں فرق ہے تو یہ عادت چھوٹی۔

پرائمری گزری تو عرب میں تشریف آوری ہو گئی، واحد دستیاب اسکول عربی تھا سو اُسی میں بھیج دیا گیا، اس نیک ارادے کے ساتھ کہ پاکستان جا کر اردو میں آٹھویں کلاس کے پیپر دلوا دیے جائیں گے۔ اب میں نے نوٹ کیا کہ اردو میں کمان تیر چلانے کے کام آتا ہے، انگلش میں کمان کا مطلب ہے آؤ۔ مگر کلاس میں جب ٹیچر نے کمان کہا تو کان کھڑے ہوئے کہ یہ بلا رہی ہے یا تیر چلا رہی ہے؟ مگر دیکھنے میں آیا کہ لڑکیاں آیت یا شعر یا جملہ دہرا رہی ہیں۔ کچھ پتہ نہ چلا کہ کیا ماجرا ہے اس قوم کا؟ اتنی عربی نہیں آتی تھی کہ مس سے پوچھ لوں۔

گھر میں ابو سے پوچھا تو انہوں نے کہا ''تمہیں بتایا تو تھا کہ آجاؤ''

میں نے ڈرتے ڈرتے اپنا سوال دہرا دیا، اب تو ابو کے غضب کی انتہا نہ رہی، امی سے کہا ''یہ کتنی کند ذہن ہے، دو دفعہ بتا چکا ہوں پھر بھی پوچھ رہی ہے۔''

امی کے ڈانٹنے پر میں نے بتایا کہ کچھ اور مطلب ہے، آپ نہیں جانتیں۔

انہوں نے پوچھا ''وہ کیا؟''

میں نے اردو کی کتاب میں لکھا دکھایا کہ یہ کیا ہے؟

امی نے کہا ''یہ اردو ہے اور وہ انگلش مطلب الگ الگ ہیں۔''

پھر میں نے کلاس میں ہونے والا روزمرہ کا ماجرا بتایا، اب تو امی بھی سوچ میں پڑ گئیں، ابو سے کہا ''یہ کہاں آپ نے بچی کو پھنسایا ہوا ہے؟''

مگر وہ تو کب کے جا کر سو چکے تھے۔

اسی طرح الفاظ کے ساتھ آنکھ مچولی چلتی رہی، بہت سے الفاظ مجھے ٹارچر کرتے رہے، اور بہت سے الفاظ پر کشش بنتے رہے، سب کا بیان کرنے لگ جاؤں تو یہ مضمون طوالت کا شکار ہو جائے گا، اس لئے باقی الفاظ کو آئندہ کسی وقت پر چھوڑتے ہوئے، اختصار سے کام لیتے ہوئے لفظ ''خصم'' پر آتی ہوں، نہ جانے کیسے اور کب یہ لفظ اردو میں آ کر شوہر کا مترادف بن گیا، جب کہ عربی میں اس کا مطلب دشمن ہے۔ اب پتہ نہیں ہماری قوم کب سے اور کیوں شوہر کو دشمن بنا کے بیٹھی ہوئی ہے اور آج کل تو یہ ''ڈسکاؤنٹ'' کے معنی میں استعمال ہونے لگ گیا ہے، بڑے بڑے شاپنگ مالز کے باہر بڑے بڑے بینرز پر لکھا ہوتا ہے ''خصم ۴۰%۔'' اب جو عورتیں قطر میں نئی نئی آتی ہیں وہ مجھ سے پوچھتی ہیں ''یہ کیا ہو رہا ہے، یہاں اس ملک میں؟ کیا شوہروں پر سیل لگی ہے یہاں؟'' تو اُن کو بتانا پڑتا ہے۔ سن کر اُن کی ہنسی چھوٹ جاتی ہے۔

ڈاکٹر خورشید نسرین، ادبی دنیا میں ''امواج الساحل'' کے نام سے جانی جاتی ہیں۔ درس و تدریس سے وابستہ ہیں۔ قطر کے مختلف تعلیمی اداروں میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیتی رہی ہیں، عربی شاعری ان کا میدان سخن ہے، سب سے پہلے ان کی رباعیاں قطر میں چھپیں، عرب شاعری کو ''ہائیکو'' سے روشناس کرایا، عربی سے اردو اور اردو سے عربی میں افسانے ترجمہ کئے، اپنے طبعزاد افسانے بھی دونوں زبانوں میں لکھے، عربی شاعری کا اردو شاعری میں اور اردو شاعری کا عربی شاعری میں بھی ترجمہ کیا۔ ''ارمغانِ ابتسام'' میں مستقل لکھتی ہیں۔

رن مرید

مراد علی شاہد

رن مرید، زن مرید، جورو کا تابع یا جورو کا غلام جسے پنجابی میں ''تھلے'' لگا بھی کہا جاتا ہے، ایک ایسا عنوان ہے جسے مرد کے چہرے سے ہی پہچان لیا جاتا ہے کہ یہ مرد اپنی یا کسی اور کی جورو کا غلام ہے، دنیا میں زیادہ تر لوگ رن مرید ہی ہیں بس کوئی مان لیتا ہے تو کسی کی رن اسے تھلے لگانے میں کامیاب ہو جاتی ہے، گویا کان دائیں ہاتھ سے پکڑو یا بائیں سے بات ایک ہی ہے، تو عافیت اسی میں ہے کہ اس فعل کا برملا کا اظہار کر دیا جائے۔ جیسے کہ ایک روائت ہے کہ ایک گاؤں سے تین لوگ گزرتے ہوئے مشکوک پائے گئے تو گاؤں والوں نے انہیں پکڑ کر نمبردار کے سامنے پیش کر دیا، پہلے شخص سے پوچھا کہ تم کہاں اور کس سے ملنے جا رہے تھے، اُس نے ڈرتے ہوئے کہا کہ میں فلاں پیر کا مرید ہوں ان کی زیارت کے لئے جا رہا ہوں، نمبردار کو غصہ آیا اور کہا کہ اسے الٹا لٹا کر جوتوں سے خاطر تواضع کی جائے، یہی حال دوسرے آدمی کا بھی کیا گیا، جب یہ سارا ماجرا تیسرے بندے نے دیکھا جو قدرے چالاک تھا وہ چالاکی دکھاتے ہوئے کہنے لگا کہ سر میں کسی پیر کا مرید نہیں ہوں میں تو بس ''رن مرید'' ہوں اب آپ کی مرضی جو چاہیں سزا تجویز کر دیجئے، نمبردار نے یونہی یہ بات سنی اپنوں بیٹوں کو باآواز بلند پکارنے لگا کہ بچوں جلدی آؤ تمہارا ''پیر بھائی'' آیا ہوں اور اس کی کھانے پینے سے خوب خاطر تواضع کرو اور دیکھو مجھے کوئی شکائت نہیں آنی چاہئے۔

اتفاق رائے سے دنیا نے اب اس بات پہ مہر تصدیق ثبت کر دی ہے کہ اقسام خاوند میں سب سے اعلیٰ پائے کا خاوند رن مرید ہی ہوتا ہے۔ رن مرید ایسا خاوند ہوتا ہے جو بیوی کے کہنے پر تو کہیں بھی بیٹھ جاتا ہے اور اگر سسرال سے کوئی کہہ دے تو مزید بیٹھ جاتا ہے۔ قبولیت ثلاثہ کے بعد ساری زندگی جی حضوری میں ہی گزار دیتا ہے اس پہ شرمندہ نہیں ہوتا، کہتا ہے بیوی کی جی حضوری نہیں کرتا بس ویسے ہی وہ مجھے بولنے نہیں دیتی۔

رن مرید چپ رہنے پر ہی اکتفا نہیں کرتا بلکہ مزید چپ میں ہی عافیت خیال کرتا ہے، دوستوں میں سے ایک بار کسی نے اس کی غیرت جگانے کے لئے فقرہ چست کر دیا کہ یار تمہاری کیا زندگی ہے تمھاری تو بیوی تمھیں گھاس بھی نہیں ڈالتی، کمال دلیری سے بولا ''شیر گھاس نہیں کھاتا اور گوشت وہ مجھے کھانے نہیں دیتی!'' کہتا ہے کامیاب ازدواجی زندگی کے دو ہی فلسفے ہیں کہ بیوی کے سامنے کبھی نہ بولو اور دوسرا ہمیشہ بیوی کی ہی سنو۔

رن مرید بیوی کے سامنے کبھی کوئی سوال نہیں اٹھاتا بس دست سوال دراز ہی ہوتا ہے۔ رن مرید ہمیشہ اپنے خاندان والوں سے بیوی کی زبان میں بات کرتا ہے اور بیوی کبھی سیدھے منہ بات نہیں کرتی کیونکہ بیوی کا کہنا ہے کہ اس نے اپنی بات بیان کرنے کے لئے خاوند کے منہ میں زبان دے رکھی ہے اور یہ بات وہ اپنی سہیلیوں میں برملا کہتی ہے کہ میں نے اپنی ساس اور سسر سے بات کرنے کے لئے ایک عدد خاوند ''رکھا'' ہوا ہے۔ خاوند کا بھی کہنا ہے کہ مجھے اللہ کے بعد میری بیوی نے رکھا ہوا ہے۔

ہمارے کامیاب رن مرید دوست ''ندیم نیڈی'' کا فلسفہ زندگی یہ ہے کہ ازدواجی زندگی کو پر سکون بنانے کا آسان نسخہ ہی یہی ہے کہ اپنی بیوی کو کبھی کام نہ کرنے دو۔ میرا اپنا بھی یہی خیال ہے کہ بیوی کی کیا جرأت کہ خاوند پہ رعب جما سکے، جب اسے نہانے کے لئے گرم پانی اور دھلائی کے لئے ہر دم تیار خاوند دستیاب ہو۔ میرے ہم عصر ظفر اقبال کا کہنا ہے کہ دنیا میں ۹۰ فیصد مرد رن مرید ہیں جبکہ بقیہ دس فیصد جھوٹ بولتے ہیں۔ جو نہیں مانتے ان کا کہنا ہے کہ ہم بیوی کی نہیں سنتے، وہ ہمیں زبردستی سناتی ہے اور جب وہ سناتی ہے تو پھر پورا محلہ کانوں میں انگلیاں دبا لیتا ہے۔

روائت ہے کہ کسی سلطنت میں رن مریدی کی وبا پھوٹ پڑی، جسے دیکھو بیوی کا چمچہ بنا بیٹھا ہے، بادشاہ نے وزیر خاص کو طلب کر کے پوچھا کہ وزیر باتدبیر یہ کیا ماجرا ہے، اگر یہ سلسلہ یونہی چلتا رہا تو رن مریدی کی یہ وبا ایک دن قصر شاہی کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔ وزیر خاص نے عرض کی'' بادشاہ سلامت اب ایسی بھی کوئی قیامت نہیں آنے والی کوئی نہ کوئی ضرور مرد کا بچہ ہوگا جو اپنی بیوی سے نہیں ڈرتا ہوگا۔'' اُس مرد کے بچے کی تلاش کے لئے بادشاہ نے دیوان عام میں عوام کو مجتمع کیا اور پوچھا کہ جو بھی رن مرید ہیں اپنا دایاں ہاتھ اوپر کریں، خلقتِ تمام نے اپنا دایاں ہاتھ سر سے اوپر کر دیا ماسوا ایک مردِ مجاہد نے۔ وزیر باتدبیر نے بادشاہ کی طرف ایک فاتحانہ نظر دوڑائی اور کہا کہ دیکھا بادشاہ سلامت میں نا کہتا تھا کہ ضرور کوئی نا کوئی مرد کا بچہ ہوگا جو اپنی بیوی سے نہیں ڈرتا ہوگا۔ بادشاہ نے جب اس سے پوچھا کہ اے مردِ حر بتاؤ کیا تم اپنی بیوی سے نہیں ڈرتے جو تم ہاتھ بلند نہیں کیا تو مرد کے بچے نے نہائت ہی معصومانہ انداز میں سہمی آواز میں اتنا ہی کہا کہ ''بادشاہ سلامت میں اپنی بیوی سے پوچھ کر بتاؤں گا کہ ہاتھ کھڑا کروں یا نہ کروں!''

رن مرید ہونے کے لئے آدمی کا شادی شدہ ہونا ضروری ہے یعنی اس کے پاس مریدی کا لائسنس حاصل کرنے کے لئے ایک عدد بیوی کا ہونا ضروری ہے اور عورت بھی اسی لئے شادی کرتی ہے کہ ایک عدد خاوند کو اپنی مریدی میں پال سکے۔ اکثر رن مرید بڑی عمر کے پڑھے لکھے مرد ہی ہوتے ہیں جو اکثر و بیشتر انڈرسٹینڈنگ کرتے کرتے بیوی کے انڈر ہی آ جاتے ہیں۔ ان پڑھ اور کم پڑھا لکھا طبقہ یہ سوچ کر بیوی سے انڈرسٹینڈنگ نہیں کرتے کہ پیدا تو بچے ہی کرنے ہیں تو پھر انڈرسٹینڈنگ چہ معنی۔

مراد علی شاہد صاحب کا بنیادی طور پر تعلق کمالیہ (پاکستان) سے ہے جبکہ سترہ برسوں سے بسلسلۂ روزگار قطر میں مقیم ہیں اور ایک پاکستانی کالج میں بطور صدر ''شعبۂ پاکستان اسٹڈیز'' فرائض منصبی ادا کر رہے ہیں۔ پسندیدہ اصناف افسانہ نگاری اور نثر نگاری میں صرف اور صرف طنز و مزاح ہے۔ ''قندِ شیریں'' کے عنوان سے کالم نگاری کرتے ہیں جو ایک موقر اخبار میں تواتر سے شائع ہو رہا ہے۔ مراد صاحب فکاہیانہ و انشائیانہ اندازِ تحریر میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ ''ارمغانِ ابتسام'' میں خاصی مستقل مزاجی سے لکھ رہے ہیں۔

عائشہ تنویر

شاعر کہیں جسے

نشہ کرنے والوں میں شاعر کو اور نشہ آور اشیاء میں شاعری کو منفرد مقام حاصل ہے۔ جام خود کبھی شراب کے نشے سے مخمور نہیں ہوتا مگر شاعری سب سے پہلے شاعر کو مدہوش کرتی ہے۔ تخیل کی دنیا میں ڈوبے اپنی جس محبوبہ کی شان میں شعراء حضرات قصیدہ گوئی کرتے ہیں اگر لوگ اس "پری پیکر" کو حقیقت میں دیکھ لیں تو انہیں اپنی شریک حیات اچھی لگنے لگے۔ حوروں کے نقشے کھینچتے یہ شعراء دِکھنے میں کیسے ہوتے، اسے احاطہ تحریر میں لانا اچھی بات نہیں کیونکہ شکل وصورت جیسی بھی ہے، اللہ پاک کی بنائی ہوئی ہے۔

بس یہ جان لیں کہ بعض اوقات کسی مجہول سے بندے کو دیکھ کر ہم مدد کے خیال سے جیب میں سکے تلاش کر رہے ہوتے مگر معلوم ہوتا کہ ان کا یہ حال غربت نے نہیں کیا بلکہ یہ خود ساختہ ادیب ہیں یا مجنوں کے جانشین نظر آتے یہ حضرت اس زمانے کے شاعر ہیں۔

شاعری کوئی جینیاتی بیماری نہیں بلکہ یہ یکدم وارد ہوتی ہے اور اچھے بھلے ذی ہوش انسان کو شاعر بنا دیتی ہے۔ پھر جس بندے کی سمجھداری کے آپ گن گایا کرتے تھے، اس کے شاعر بنتے ہی آپ کا کام ختم ہو جاتا۔ اب گانے، گنگنانے کا کام صرف ان کے ذمے رہتا اور آپ سننے پر مجبور ہوتے۔

یونیورسٹی میں ہمارے ایک بہت قابل دوست ادب پروری کے شوق میں شاعری کو پیارے ہو گئے مگر شاعری انہیں بالکل "پیاری" نہ تھی۔ وہ حضرت، جنہوں نے سب کو آگے لگایا ہوا تھا،

بیوی کے بھی حقوق ہیں مگر شوہر سے کم، شوہر کے بھی فرائض ہیں مگر بیوی سے کم۔ **کلیاتِ مختصرات از خالد حنیف**

اب سب کے پیچھے پڑ گئے۔ انہیں جا بجا سامعین کی ضرورت ہوتی اور وہ اپنی ضروریات پوری کرنا جانتے تھے۔ چنانچہ ڈیپارٹمنٹ میں کوئی ایسا نہ تھا جو ان کے ''شیروں'' کے ضرر سے محفوظ رہ پایا ہو۔ ان کی شاعری تو ہم دل پر پتھر اور کانوں میں روئی رکھ کر برداشت کر ہی لیتے مگر ان کے استعارے و تشبیہات کون سنتا۔ وہ شاعری میں کچھ نیا کرنا چاہتے تھے۔ لب گلاب، چشم شراب سے نکل کر نئی مثالیں لاتے۔

کڑکتی دھوپ سے جب سب پناہ مانگ رہے ہوتے، وہ اسے محبوبہ کے رخِ روشن سے تشبیہ دے کر سر دھنتے۔ سڑک پر پڑے گڑھے کو دیکھ کر انہیں گال کا بھنور یاد آتا تو استادِ محترم عدو کی مثال لگتے۔ قلم لانبی انگلیوں کی یاد دلاتا تو سموسہ دیکھ کر محبوبہ کے چہرے کی تکونی ساخت یاد آتی۔ کینٹین کے رش، میں یہ بالکل نہ گھبراتے، آگ کی حدت انہیں محبوبہ کے مزاج کی گرمی لگتی اور کیچپ کی سرخی میں لپ اسٹک کا رنگ محسوس کرتے تو خراب کیچپ کا ذائقہ بھی اعلیٰ لگتا۔ دیگر افراد کی طرح وہ جلدی کا شور مچانے بجائے اپنی تخلیقی صلاحیت کا اظہار کرتے وہیں کھڑے غزلوں پر غزلیں کہہ ڈالتے اور کام میں مصروف افراد ان کے مجبور سامع کا کردار ادا کرتے۔ اس شاعری کے شر سے بچنے کے لیے ہجوم کا حق مار کر بھی کینٹین والے سب سے پہلے انہیں چلتا کرنے کی فکر کرتے۔ اسے بھی وہ اپنی عزت افزائی ہی لیتے کہ شعراء کا ادب اور شاعری کا ذوق ہر ایک میں نہیں ہوتا۔

تمام مضامین میں شاندار نمبروں سے فیل ہونے کے بعد انہوں نے اپنی شاعری کو ایک نیا موڑ دیا۔ ہر بڑے شاعر کی طرح ان کی شاعری کا بھی اگلا دور نہایت شاندار تھا۔ اس دور میں انہوں نے برسوں کی کمائی عزت شاعری کے عروج کے لیے قربان کر دی۔ چائے کے علاوہ انہوں نے کبھی کسی چیز کا نشہ نہیں کیا تھا اور لڑکیوں کو اس تعداد میں بہن بنایا ہوا تھا کہ یونیورسٹی کی لڑکیوں کو بآسانی ان کی بہن ہونے، نہ ہونے کی بنیاد پر کیٹگرائز کیا جا سکتا ہے۔ اس کے باوجود اب ان کی شاعری شباب و شراب سے مرصع ہوتی ہے۔ ان کا ماننا تھا، شاعر شریف ہو سکتا ہے مگر شاعری نہیں۔ غزل میں سراپا غزل کا نقشہ نہ کھینچا جائے تو وہ کسی کام کی نہیں۔

بات ان کی بھی درست ہے انسان کو اپنا کام دل لگا کر ہی کرنا چاہیے اگر وہ شاعری سے قوم کی اصلاح نہیں کر سکتے تو دوسری راہیں تو دکھا سکتے ہیں۔ کیا ہوا جو ادبی حلقوں میں ان کا نام اچھے الفاظ میں نہیں لیا جاتا، نوجوان نسل ان کے کام کی قدردان تھی۔ وہ عامل بابا بنگالی نہ تھے مگر اپنی ایسی جادو اثر شاعری سے محبوب قدموں میں لا بٹھاتے تھے۔ احباب بتاتے ہیں کہ ان کی اس دور کی شاعری اگر کتابی صورت میں لائی جاتی تو اس پر واضح الفاظ میں لکھا ہوتا ''بچوں کی پہنچ سے دور رکھیں۔'' مگر پبلشر نے پیسے جیب سے لگانے پر بھی ایسی کتاب کی اشاعت سے انکار کر دیا۔ دراصل ان کے پبلشر کی بھی اپنی اخلاقی مجبوریاں تھیں۔ بے وزن شاعری تو عوام بصد خوشی برداشت کر لیتی مگر ایسی آگ لگانے والی شاعری کے بعد فتووں کی آگ سے ان کا ادارہ بھی خاک ہو سکتا تھا۔

بہر حال زمانہ ایک دم بدلا، اب آنے والی نئی نسل کو بگڑنے کے لیے کسی کھلی چھپی شاعری کی ضرورت نہیں رہی تو انہوں نے بھی اپنا کردار ایک دم بدل لیا۔ اب وہ فیس بک پر نامور نقاد کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ نئے آنے والوں کو شاعری سکھانا ان کا کام ہے۔

عائشہ تنویر صاحبہ کا تعلق کراچی سے ہے۔ محترمہ نے ریاضی میں ایم ایس سی کیا ہوا ہے۔ میدانِ ادب میں نو وارد ہیں لیکن اندازِ بیان کی پختگی اور لب و لہجے کی چلبلاہٹ اور بیساختگی سے اُن کے نکاہی معیار کا پتہ چلتا ہے۔ طنز و مزاح، بچوں کی کہانیاں اور سماجی و معاشرتی موضوعات کو تختۂ مشق بنایا ہے۔ مختلف بچوں اور خواتین کے جرائد میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ''ارمغان ابتسام'' کے لیے بھی گاہے گاہے بازخواں ہوتی رہتی ہیں۔

ڈاکٹر عابد معز

میں صاحبِ شکر ہو گیا

میرا یہ ایقان ہے کہ انسان اس وقت تک صحت مند رہتا ہے جب تک وہ ڈاکٹروں سے دور رہتا ہے۔ اسی لیے میں ڈاکٹروں سے ملنے سے کتراتا ہوں۔ حتیٰ کہ میں اپنے ڈاکٹر دوستوں سے بھی دُور رہنا پسند کرتا ہوں۔ ڈاکٹر سے ملاقات ہونے پر ہمیں ہی کوئی نہ کوئی تکلیف یاد آتی ہے یا پھر ڈاکٹر خود ہمارے جسم میں کچھ نہ کچھ نقص نکال بیٹھتے ہیں۔ ڈاکٹر اگر کسی کو صحت مند قرار دے دیں تو پھر وہ ڈاکٹر کیوں کر ہوئے؟ ملاقاتیوں میں تک بیماری تشخیص کرنا جیسے ان کے فرائض میں داخل ہے۔

چند دن قبل میں اپنے ایک ڈاکٹر دوست کے مطب کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ چند لمحے رک کر سوچنے لگا کہ موصوف سے ملاقات کرلوں اور کسی بیماری کو گلے لگالوں یا پھر خاموشی سے گزر جاؤں۔ اسی دوران خود ڈاکٹر مطب سے برآمد ہوئے۔ بہت خلوص سے ملے اور گلے میں ہاتھ ڈال کر مجھے مطب میں لے گئے۔ خیر خیریت پوچھی اور طبیعت کے بارے میں دریافت کیا۔ میں نے کہا ''خدا کا شکر ہے، طبیعت بہت اچھی ہے۔''

''لیکن مجھے تمہاری صحت ٹھیک نہیں لگتی۔'' یہ کہہ کر موصوف مختلف سوالات کرنے لگے۔ ''بھوک کیسی ہے۔ کیا سر درد ہے۔ ہاتھ پیروں میں تکلیف تو نہیں ہے۔ کیا کبھی بخار آتا ہے وغیرہ وغیرہ۔''

سب سوالوں کے جوابات میں نے نفی میں دیے تو موصوف میرا معائنہ کرنے لگے۔ معائنہ میں بھی کچھ ہاتھ نہ لگا۔ انہیں صرف میرا پیٹ بڑھا ہوا نظر آیا۔ پیٹ کی طرف اشارہ کرکے پوچھا ''یہ

توند کب سے ہے؟''

''بہت عرصے سے۔ شاید پانچ، دس برسوں سے۔ بھوک کھل کر لگتی ہے تو ڈٹ کر کھاتا ہوں۔ اسی سبب یہ توند ہے۔'' میں نے اپنی توند پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا۔

''مجھے یہی توند تمھاری صحت کی راہ میں حائل لگتی ہے۔ ابھی میں تمہارے خون کا معائنہ کرتا ہوں۔'' اور میرے جواب کا انتظار کیے بغیر موصوف نے میرے بائیں ہاتھ کے انگوٹھے کو چھید کر ایک قطرہ خون نکالا اور معائنہ کر کے فاتحانہ انداز میں فرمایا ''مجھے یقین تھا کہ تمہیں شوگر ہے۔''

میں نے پریشان ہو کر ان سے پوچھا ''مجھے کیا ہے؟''

''تمھیں شکر کی بیماری یعنی اردو میں ذیابیطس اور انگریزی میں ڈیابیٹس ہے۔'' ڈاکٹر نے بتایا۔

''نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔ مجھے کوئی شکایت ہی نہیں ہے۔'' میں نے ان کی تشخیص سے اتفاق نہ کرتے بلکہ اسے رَد کرتے ہوئے کہا۔

''اس مرض میں اکثر کوئی شکایت نہیں ہوتی۔ مریض بے خبر ہوتے ہیں۔ بعض تو بے خبری میں مارے بھی جاتے ہیں۔ میرا شکریہ ادا کرو کہ میں نے تمھیں وقت سے پہلے آگاہ کر دیا ہے۔'' میرے ڈاکٹر دوست نے احسان جتایا۔

''مجھے یقین نہیں آرہا ہے۔ کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟ تم مذاق تو نہیں کر رہے ہو۔ کیا واقعی مجھے ذیابیطس ہے۔'' میں نے پریشان ہو کر ایک ساتھ چند سوالات کر ڈالے۔

''میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں اور یہ معائنہ کی مشین جھوٹ نہیں بولتی۔ ہر مریض کا پہلے پہل یہی ردِ عمل ہوتا ہے۔ اسے یقین نہیں آتا لیکن دھیرے دھیرے بات اس کی سمجھ میں آتی ہے۔ ویسے یہ اتنی زیادہ پریشان ہونے کی بات نہیں ہے۔'' میرے ڈاکٹر دوست نے سمجھایا۔

''تمھارے لیے تو کوئی بھی مرض پریشانی کا باعث نہیں ہے۔ یہ تو تمھارا روزمرّہ ہے۔ تم لوگ صحیح یا غلط تشخیص کر دیتے ہو۔ بھگتنا تو ہمیں پڑتا ہے۔ نزلہ، کھانسی اور زکام کی طرح مرض ذیابیطس دو چار دنوں یا ہفتے بھر کا مرض نہیں ہے۔ ایک مرتبہ یہ مرض آجائے تو پھر مرتے دم تک ساتھ نہیں چھوڑتا بلکہ مارنے تک نہیں چھوڑتا۔ تم لوگ ہی کہتے ہو کہ ذیابیطس بڑا وفادار مرض ہے۔ ایک وقت ہاتھ پکڑ لے تو پھر شریکِ حیات سے زیادہ وفا شعار ثابت ہوتا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ تم کوئی معمولی مرض تشخیص کر دو۔ الرجی مناسب رہے گا۔'' میں نے گزارش کی۔

''دوسرے مرض کی گنجائش نہیں ہے۔ اسی مرض کی تشخیص بہت مشکل سے ہوئی ہے۔'' ڈاکٹر نے جواب دیا۔

''میں کسی دوسرے ڈاکٹر کی رائے بھی حاصل کروں گا۔'' میں نے اپنا فیصلہ سنایا۔

''تمھارے لیے یہی بہتر ہے۔ تم مجھے فیس دو گے نہیں اور اگر دو گے بھی تو میں لے نہیں سکتا اور یہ بات اپنی جگہ مسلمہ ہے کہ ادائیگی کے بغیر افاقہ ممکن نہیں ہے۔ کیا میں کسی اسپیشلسٹ کا پتہ دوں۔'' ڈاکٹر نے مشورہ دے کر سوال کیا۔

''ضرورت نہیں ہے، میں ڈھونڈ لوں گا۔'' ڈاکٹر دوست کے مطب سے میں ذیابیطس کا طوق اپنے گلے میں لٹکائے باہر نکل آیا۔

احباب سے پتہ کر کے میں ذیابیطس کے ایک اسپیشلسٹ سے رجوع ہوا۔ معائنہ کے دوران موصوف کو بھی کچھ ہاتھ نہ لگا۔ انھوں نے بھی خون کا معائنہ تجویز کیا۔ اسپیشلسٹ ہونے کا ثبوت دینے کے لیے انھوں نے خون کے دو چار مختلف معائنے کروانے کے لیے لکھا۔ اب تک میں خون کو صرف خون سمجھتا تھا جو ہماری رگوں میں دوڑتا پھرتا ہے اور جو ہمارے دل و جگر میں رہتا ہے۔ اب پتہ چلا کہ خون تو ایک بحرِ بیکراں ہے اور اس میں بہت کچھ ہے۔ خلیے ہیں۔ مختلف مادّے ہیں۔ آکسیجن ہے۔ کاربن ڈائی آکسائیڈ بھی ہے۔ ہیموگلوبن بھی ہے۔ توانائی دینے کے لیے گلوکوز ہے تو پریشان کرنے کے لیے کولیسٹرال بھی ہے۔

خون کے معائنوں سے پتہ چلا کہ میرے خون میں شکر کی مقدار زیادہ ہے۔ ذیابیطس کی تشخیص کی توثیق ہوئی۔

ذیابیطس عجیب وغریب مرض ہے۔ میں ایسے کہہ رہا ہوں

ڈاکٹر وزیر آغا کے انشائیوں کو تو ہم اس لیے پڑھ لیتے ہیں کہ ہمارے پڑھے لکھے ہونے کا بھرم قائم رہ سکے لیکن کسی دوسرے کے انشائیے پڑھنے سے ہم اس لئے ڈرتے ہیں کہ کہیں اس شخص کے پڑھے لکھے ہونے کا بھرم نہ جاتا رہے۔ مشفق خواجہ

جیسے دوسرے امراض عام اور نارمل ہوتے ہیں۔ ہر مرض عجیب ہی ہوتا ہے۔ دراصل صحت مند رہنا عام اور نارمل حالت ہے۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ذیابیطس اس لحاظ سے عجیب وغریب ہے کہ اس مرض کے علاج کے لیے مریض کا ذیابیطس کے بارے میں جاننا اور ذیابیطس کو اچھی طرح سے سمجھنا ضروری ہے۔ دوسرے امراض میں مریضوں کو اپنے مرض کے بارے میں اتنی معلومات درکار نہیں ہوتیں۔ مریضوں کو ذیابیطس کے بارے میں باقاعدہ پڑھنا پڑتا ہے۔ ذیابیطس سے زندگی بھر کا جو ساتھ ہے۔ ظاہر ہے کہ مریض ڈاکٹر کو ہر دم اور ہر وقت ساتھ نہیں رکھ سکتا۔ اسی لیے بہتر ہے کہ مریض خود اپنے مرض کا ڈاکٹر بھی بن جائے۔ بعض مریض شکر کے مرض کے بارے میں معالجین سے زیادہ جانتے ہیں۔ سنا ہے کہ پرانے مریض باقاعدہ مطب کرتے ہیں۔ نئے مریضوں کی ہمت بندھاتے ہیں اور انہیں مشورے دیتے ہیں۔

ایک پرانے مریض نے میری ہمت بندھائی ''آپ اتنے زیادہ خوفزدہ کیوں ہیں۔ اب تو ذیابیطس ایک عام مرض ہے۔ دنیا کے ہر خطہ میں ذیابیطس اور اس کے مریض موجود ہیں۔ کروڑہا افراد اس کے ساتھ نباہ کر رہے ہیں۔ مختلف مقامات پر دس تا پندرہ فیصد سے زیادہ لوگ اس مرض میں مبتلا ہیں۔ مریضوں کی تعداد میں دن بہ دن اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔ مریضوں نے انجمنیں بنائی ہوئی ہیں۔ آپ اکیلے نہیں ہیں۔ سب ذیابیطسی مریض آپ کے ساتھ ہیں۔''

''میں صرف یہ سوچ رہا ہوں کہ یہ مرض مجھے کیوں ہوا ہے؟'' میں نے اپنی پریشانی بتائی۔

''اصل وجہ ڈاکٹر بھی نہیں جانتے! یہ مرض وراثتی ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ آرام طلبی، غیر حرکیاتی زندگی، موٹاپا، بوڑھاپا، غذا میں بے قاعدگی، زیادہ میٹھا کھانا، چکنائی کا زیادہ استعمال، چند دوائیں، وائرس کا حملہ آور ہونا، ذہنی پریشانی، وغیرہ وغیرہ، غرض اس مرض کے کئی اسباب بتائے جاتے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک سبب سے آپ کو ذیابیطس ہو سکتی ہے۔'' مرض کی مختلف وجوہات بتا کر موصوف نے مجھے مشورہ دیا ''آپ زیادہ مت سوچیے۔ مرض بڑھ جائے گا۔ وجوہات جاننے کی بجائے مرض کو قابو میں رکھنے کی کوشش کیجیے ورنہ مرض آپ پر حاوی ہو کر مختلف پیچیدگیاں پیدا کر سکتا ہے۔''

''کیسے؟'' میں نے سوال کیا۔

''غذا میں احتیاط اور نظم وضبط کے ساتھ زندگی گزارنے سے ہمارے جسم میں شکر نارمل حد میں رہتی ہے اور جیسے ہی آپ نے ڈھیل دی اور لاپروائی برتی تو شکر بے قابو ہو کر بلڈ پریشر میں اضافے کا باعث بنتی ہے۔ دل و دماغ کو ماؤف کر دیتی ہے۔ بینائی متاثر کرتی ہے۔ گردے خراب کرتی ہے۔ جسم کا تقریباً ہر عضو متاثر ہوتا ہے۔ اسی لیے اسے ام الامراض کہتے ہیں۔''

موصوف کا بیان سن کر مجھے لگا کہ شکر کی بیماری حقیقت میں شریکِ حیات ہے۔ ذیابیطس کے عادات واطوار بہت حد تک گھر والی سے مشابہہ ہیں اور یہ اصول کتنا کھرا ہے کہ اگر ہم اسے قابو میں نہ کر پائیں تو وہ ہم پر کنٹرول کر لیتی ہے اور جینا دوبھر ہو جاتا ہے۔

مرض ذیابیطس اپنے مریضوں سے سخت ڈسپلن اور نظم وضبط کا مطالبہ کرتا ہے۔ وقت پر کھانا اور پینا، ضرورت سے زیادہ نہ کھانا، اپنے وزن کو قابو میں رکھنا، ہاتھ اور پیروں کو صاف ستھرا رکھنا، جسم کی صفائی کا سختی سے خیال رکھنا، پابندی کے ساتھ ہلکی ورزش کرنا، زیادہ نہ سوچنا، ہر دم خوش رہنے کی کوشش کرنا وغیرہ جیسے احکامات صادر کرتا ہے۔ ان احکامات کو بجا لانے میں ذرا سی بھی بداحتیاطی کرنے پر مرض ذیابیطس مریضوں کو سزا دیتا ہے۔ شکر بڑھنے سے مریض سخت بیمار پڑ جاتا ہے۔ ذیابیطس کے اس نظم وضبط کو دیکھ کر مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ذیابیطس کا مزاج آمرانہ بھی ہے۔

مرض ذیابیطس کھانے پر مختلف پابندیاں عائد کرتا ہے۔ شکر کے مریضوں کو ناپ تول کر کھانا پڑتا ہے۔ شکر اور میٹھی چیزوں سے

پرہیز ضروری ہے۔نزاکت سے تھوڑا تھوڑا کھانا پڑتا ہے۔من مانی کرنے سے خون میں شکر بڑھ جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ ''کھانا برائے زندگی'' کا اصول اپنانا پڑتا ہے اور زندگی برائے کھانے کو تیاگ دینا پڑتا ہے۔کسی ماہر تغذیہ کے آگے زانوئے ادب تہہ کرنا پڑتا ہے کہ حضور بتایئے ہم کیا کھائیں، کیوں کھائیں، کتنا کھائیں، کب کھائیں اور کیسے کھائیں۔

ہدایات کے مطابق کھالیا، پی لیا، چلئے صاحب قصہ تمام ہوا۔ نہیں جناب کہانی تو اب شروع ہوئی ہے۔کھائی ہوئی غذا کو ہضم کرنے کے لیے شکر کے مریضوں کو ہردن پیدل چلنا ضروری ہے۔ماہرین بتاتے ہیں کہ ہلکی ورزش مریضوں کے لیے مفید ہوتی ہے۔

اپنے آپ کو تولنا پڑتا ہے کہ کہیں زیادہ یا کم تو نہیں کھارہے ہیں۔وزن اگر زیادہ ہے جو اکثر مریضوں میں ہوتا ہے تو کم کھا کر اور زیادہ دوڑ کر وزن کو کم کرنے کا نسخہ تجویز کیا جاتا ہے۔وزن اگر کچھ کم ہے تو مناسب ہے اور اگر بہت کم ہے تو مشکلات کا باعث ہے۔نارمل وزن خوشی اور انبساط کا باعث ہے لیکن اسے نارمل رکھنا پل صراط پر چلنے کے مساوی ہے۔

اپنے آپ کو تولنے کے علاوہ مریضوں کو شکر کی مقدار کے لیے اپنے خون اور پیشاب کا وقتاً فوقتاً معائنہ کرنا پڑتا ہے۔ یہ وقتاً فوقتاً ہر دن بھی ہوسکتا ہے اور دن میں دو یا تین مرتبہ بھی۔مریضوں کو خون اور پیشاب میں شکر کی مقدار کا اندازہ کرنے کے طریقے سیکھنے پڑتے ہیں۔شکر کی مقدار معلوم کرتے رہنے سے مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میرا جسم ایک شکردانی ہے جس میں وقتاً فوقتاً شکر کی مقدار کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ جب شکردانی میں شکر لبریز ہوجاتی ہے تو شکر قارورہ میں چھلک پڑتی ہے۔مریض اکثر ایک دوسرے سے سوال کرتے ہیں۔''آپ کی شکردانی میں شکر کہاں تک ہے، خون میں ہی ہے یا پیشاب تک آگئی ہے۔''

خون میں شکر کی مقدار دیکھ کر دوائیں اور دواؤں کی خوراک تجویز کی جاتی ہے۔ پرانے مریض یہ کام خود ہی انجام دے لیتے ہیں۔ڈاکٹر صرف رہنمائی کرتے اور اپنی فیس بٹورتے ہیں۔اپنے جسم اور خون میں شکر کم کرنے کے لیے مریض اپنے آپ پر مختلف تجربے بھی کرتے ہیں۔کوئی میتھی کی چٹنی استعمال کرتا ہے تو کوئی امرود کے پتوں کا جوشاندہ پیتا ہے۔

ذیابیطس کے مریضوں کو اپنی بیماری اور علاج کا بہی کھاتا کھولنا پڑتا ہے۔اس کھاتے میں خون اور قارورہ کے معائنے کے نتائج، غذا کی تفصیلات، اپنا وزن اور دواؤں کی مقدار کے بارے میں اندراجات کرنا پڑتا ہے۔خون میں شکر کی مقدار اور اس پر غذا اور دوا کے اثرات کو گراف کی شکل میں پیش بھی کیا جاتا ہے۔غذا اور علاج کے سبب جسمانی وزن میں ہونے والے تغیرات کا بھی اشکال کے ذریعہ مطالعہ کیا جاتا ہے۔ بیماری کے اس بہی کھاتے سے دوائیں تجویز کرنے اور غذا استعمال کرنے میں مدد ملتی ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر انسانی جسم اتنا ''حسابی اور کتابی'' ہوتا تو جسم میں کہیں کوئی ایسا پیمانہ یا میٹر بھی لگا ہوتا جس سے ہمیں شکر کی مقدار کا آسانی سے اندازہ ہوگیا ہوتا۔ڈاکٹروں سے درخواست ہے کہ وہ اس میٹر کو دریافت کریں۔

شکر کو قابو میں رکھنے کی کوششوں اور دواؤں کے استعمال کے دوران بعض مرتبہ شکر کم بھی ہوجاتی ہے۔شکر کم ہونے سے بھی خاصی پریشانی ہوتی ہے۔خون میں شکر کم ہونے کی داستانِ الم پھر کبھی بیان کروں گا۔ فی الحال اتنا کہوں گا کہ ہائے رے انسان کی بے بسی۔ ایک معمولی شکر بڑھ کر یا کم ہوکر اسے کتنا پریشان کرتی ہے!

عابد معز صاحب کا تعلق حیدرآباد (بھارت) سے ہے۔پیشہ کے اعتبار سے ڈاکٹر ہیں۔اُردو ادب سے اِن کی محبت بہت پرانی ہے۔طنز و مزاح اِن کا خصوصی میدان ہے۔اُردو طنز و مزاح سے حوالے سے اِن کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ ماہنامہ ''شگوفہ'' حیدرآباد کے مدیر بھی رہ چکے ہیں۔''شگوفہ'' کے علاوہ بہت سے ادبی و غیر ادبی جرائد میں اِن کے مزاحیہ مضامین تسلسل کے ساتھ شائع ہوتے رہے ہیں۔بہت نفیس طبیعت کے مالک ہیں۔

کائنات بشیر، جرمنی

چاند نگر

زندگی کبھی تو یونہی گزر جاتی ہے بغیر کسی شور و غل، بلچل کے بالکل سیدھے رستے پر۔۔۔ کہ زندگی سے کوئی شکوہ باقی نہیں رہتا لیکن کچھ لوگوں کے لیے ایسا نہیں ہوتا۔ وہ بچارے زندگی کے تالاب میں ڈوبتے، ابھرتے اور غوطے کھاتے رہتے ہیں۔ اُنہیں دوسرے لوگوں سے زیادہ ہاتھ پیر چلانے پڑتے ہیں۔ ضرورت سے زیادہ طاقت لگانی پڑتی ہے۔ پھر بھی منزل ملے نہ ملے۔۔۔ واللہ اعلم۔

کچھ لوگ قدرتی چندے آفتاب چندے مہتاب ہوتے ہیں۔۔۔ چاند سا حسن لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ مائیں اُنہیں نظر لگنے کے ڈر سے کالا ٹیکا لگا کر نظر اتارتی ہیں۔ یہ اپنے گورے رنگ پر اتراتے اور گنگناتے رہتے ہیں،

گورے رنگ کا زمانہ کبھی ہوگا نہ پرانا

یا آئینہ ہاتھ میں لے کر،

پٹھے سدھے بودے وا کے شہری بابو

چلیا

اُنہیں لگتا ہے کہ آئینہ صرف اُنہی کے لیے بنا ہے۔ شاعر حضرات نے بھی اپنی شاعری میں اُنہی کو جگہ دے کر اُنہیں اپنے حسن پر نازاں ہونے کا موقع فراہم کر دیا ہے۔ جبکہ دوسری طرف کچھ لوگ پیدا ہی سانولے سلونے روپ کے ساتھ ہوتے ہیں جنہیں کالا کہہ دینے میں کوئی حرج نہیں۔ تو مائیں ایسوں کو رگڑ رگڑ کر نہلاتی ہیں۔ کبھی کریم، کبھی پاوڈر لگا لگا کر اُنہیں گورا کرنے کی فکر میں رہتی ہیں۔ ساتھ کوستی رہتی ہیں ۔۔۔ ''منحوس مارا اللہ جانے کس پر چلا گیا۔۔۔''

دوست احباب بھی بڑے آرام سے ''نظر بٹو'' کی عرفیت

سے نواز دیتے ہیں۔ اگر لڑکی سانولی کالی ہو تو سب کو اس کی قسمت کی فکر لگ جاتی ہے۔ کئی بار پوری فیملی گوری چٹی اور بیچ میں ایک آدھ ایسے رنگ روپ والا بچہ سب کو گرہن کی طرح چمٹ جاتا ہے۔ تو دوسرے بھائی بہن اپنے دوستوں کے سامنے اسے نظر انداز کر دیتے ہیں یا لاعلمی ظاہر کرتے ہیں۔ دوست احباب بھی ایسے پوچھتے ہیں ''کیا یہ تمہارا نوکر ہے؟''

دراصل قصور ان کا بھی نہیں، آخر وہ بھی تو انسان ہیں، خطا کے پتلے ہیں جو کھلی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، اُسی سے دھوکا کھا جاتے ہیں۔ اُنھیں کہاں اندازہ ہوتا ہے کہ اتنے حسین اور خوبصورت لوگوں کے ساتھ للو پنجو قسم کے لوگ بھی رہتے ہیں۔ والدین بھی اپنے سلونے شاہکار کو دوسروں کے سامنے پیش کرنے سے ہچکچاتے ہیں جو غلطی سے ان کی پروڈکشن میں چلا آیا۔ نمونے کے طور پر وہ سرخ ٹماٹر یا گلابی سیب رخسار جیسے بچے کو اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔

ایک گھر میں دو بیٹیاں تھیں تو ماں ہمیشہ خوبصورت بچی کو اپنے ساتھ ہر پارٹی، تقریب میں رکھتی تھی۔ جو کم شکل تھی، اُسے حیلے بہانے سے گھر چھوڑ جایا کرتی اور کسی سے متعارف کرانے سے بھی کتراتی۔ تو ایک بار اسی بچی نے چلا چلا کر ماں کو اپنے ساتھ ہونے والی اس زیادتی، ناانصافی کا احساس دلایا اور اپنے حق کے لیے علم بلند کیا۔

۲

کم رو لڑکی کو چونکہ پہلے ہی اس کی کم مائیگی کا احساس دلا دیا جاتا ہے تو اکثر اس کے اندر گھنٹی بج جاتی ہے کہ وہ اس میدان میں اترے بغیر ہار چکی ہے، تو اپنی بقاء کے لیے اسے اپنے اندر کچھ اور خوبیاں پیدا کرنا ہوں گی۔ سو وہ زبیدہ خاتون بننے میں لگی رہتی ہے۔ اسی کوشش میں دوسرے بہت سے وصف پیدا کر لیتی ہے۔ والدین کی خدمت، اُن کی ذمہ داریوں میں ہاتھ بٹانا، دوسروں کے کام آنا، اچھا کھانا پکانا، شادی کے بعد شوہر کے دل میں اترنے کا راز بخوبی پانے کی کوشش کرنا۔ کوئی میگزین، ڈائجسٹ پڑھ دیکھیے۔ روپ والی ہمیشہ نخرے دکھاتی اور دوسروں پر رعب جماتی

ملے گی۔ جبکہ لیلیٰ جیسی ہیروئن اچھے اچھے کھانے بنانا جانتی ہے۔ سلائی کڑھائی میں ماہر۔۔۔ فرمانبردار اتنی کہ محلے بھر کے کام نپٹا کر دعائیں لیتی ہے اور حسیناؤں کے لیے مشکل پیدا کر دیتی ہے۔ یا پھر ایسی لڑکیاں اپنی آواز کا جادو جگانا چاہتی ہیں۔ زیبا نہ سہی مالا سہی۔۔۔!

اب جہاں تک بات رہی ایک لڑکے کے روپ کی تو معاشرتی طور پر اسے ان مشکلات، باتوں کا سامنا نہیں کرنا پڑتا جن سے گزر کر ایک لڑکی کندن بن جاتی ہے۔ مرد کو اس معاشرے نے ویسے ہی خوامخواہ کی چھوٹ دے رکھی ہے۔ سب کو بس اس کے مرد ہونے سے غرض ہے یا اس کی کمائی سے۔! دنیا میں اس کا نزول ہی اس کی کامیابی کی دلیل ہے۔ معاشرے کو وہ کسی ماں کی خوش قسمتی کا مہرا لگتا ہے یا کسی ماں کی سالوں کی منت مرادوں کا حصول۔۔۔ یہی بات اس کے بگڑنے کو کافی ہے۔۔۔ اس کی اَنا کا جھنڈا بچپن سے ہی بلند ہو جاتا ہے۔ شادی کے لیے نہ تو اس کو پڑھائی کی کتابوں

میں تولا جاتا ہے، خوبصورتی اور نہ ہی دوسرے اوصاف کو۔۔۔(ہے نا ٹھیک ٹھاک معاشرتی دھاندلی) چاند جیسی دلہن کے ساتھ موٹا کالا بھجنگ پپیں بھی چل جاتا ہے۔ اُلٹے بانس بریلی کو، دنیا کے سامنے ایسے اتراتا ہے جیسے گوری چٹی مہتاب جیسی بیوی لا کر اس نے دنیا فتح کر کے اپنے سینے پہ کوئی تمغہ ٹانک لیا ہے۔ اندر کی بات، وہ تو اس کی خوبصورتی کو اپنے لیے کیش کراتا ہے۔ حالانکہ اسے تو چاند کے داغ کو بغور دیکھتے رہنا چاہیے مگر خیر۔۔۔ وقت نے انگڑائی لے لی ہے۔ اب لڑکیاں بھی ہونے والے بندے کو ٹھوک بجا کر دیکھتی ہیں۔ نہ ہی کسی تھو جیسے بندے کے پہلو میں کھڑی ہو کر باپ کی پگ کو زمین بوس ہونے سے بچاتی ہیں بلکہ ویلیمے کی ساڑھی شوہر کے سوٹ سے میچ کرواتی ہیں۔ میچ نہ ہو تو اس کا سوٹ ہی بدلوا دیتی ہیں یا دلہا ہی۔

کبھی کے دن بڑے کبھی کی راتیں۔۔۔،

ان لڑکیوں کے طفیل اب مرد بھی بننے سنورنے لگا ہے۔ آئینے میں اپنا جلوہ دیکھنا اسے بھی اچھا لگنے لگا ہے۔ اب اسے بھی اپنی خوبصورتی، سمارٹ نیس، کیل مہاسوں اور سفید بالوں کی فکر ہونے لگی ہے۔ سو مردوں کے بھی ڈھیروں بیوٹی سیلون کھل چکے ہیں۔ ہیر سیلون تو پہلے سے تھے۔ (وئی، مردوں کو بیوٹی سیلون کھولنے کا آئیڈیا پہلے کیوں نہ آیا۔ ئی) شادی کے روز اب اسے بھی باقاعدہ تیار ہو کر آنا پڑتا ہے۔ ایک ان دیکھے مقابلے کی فضا اسے بھی ٹینشن دینے لگی ہے۔ اب اس کا پاس ہونا بھی ضروری ہے۔ چلو اچھا ہے مرد کو یوسف ثانی بننے کا خیال تو آیا ورنہ مفت میں زلیخا کے پہلو میں جا کھڑا ہوتا تھا۔ چلو کم از کم اسی بہانے کچھ مردوں کے روزگار کا جوگاڑ پیدا ہوا۔ بیروزگاری کی شرح بھی کچھ کم ہوئی۔

یوسف ثانی بننے کے ساتھ اب اس کی جیب بھی بھاری ہونی چاہیئے۔ مرد کی جیب ضرور بھاری رہے مگر اس کا اپنا وزن ہلکا ہی رہنا چاہیئے۔۔۔ اگر ایسا نہیں تو خسارے میں رہے گا۔ کیونکہ روپیہ پیسہ تو اب لڑکیاں بھی ڈھیروں کما لیتی ہیں۔ تو کجا کہ مرد کے پیر کی جوتی بننا۔۔! اب وہ اپنی ذات کو ارزاں نہیں بناتیں۔ ورنہ کتنی بڑی معاشرتی ناانصافی تھی کہ جس موڑ سے مرد آرام سے آگے بڑھتا رہا اسی موڑ پر لڑکی کے لیے ڈھیروں رکاوٹیں کھڑی ہوتیں۔ ایک لڑکی کو چھان پھٹک کر دیکھا جاتا رہا۔ ایک ماں بھی جب ساس کے رتبے پر فائز ہونے کا سوچتی تو اس کے ذہن میں بہو کا جو تصور اترتا وہی بیٹے کی ذہن میں بھی منعکس کرنے کی کوشش کرتی۔ چاند سی دلہن، جسے تلاش کرتے کرتے دوسروں کی چائے دعوتیں کھاتے کھاتے اس کا اپنا وزن بڑھ جاتا اور جوتیاں گھس جاتیں۔۔۔ اگر ارینج شادی ہوتی تو شادی کی رات دولہا کا دل دھک دھک کرتا رہتا کہ اللہ جانے سیج پر گھونگھٹ کی آڑ میں کونسا روپ چھپا بیٹھا ہے۔ وہ ایسے گھونگھٹ اٹھاتا جیسے اس کی لاٹری کھلنے والی ہو۔ ایک افسانے کا ابتدائی ڈائیلاگ ہی یہی تھا ''دلہن اتنی خوبصورت ہوگی ارسلان نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔''

ہاں بھئی۔۔۔ مردوں نے کہاں سوچا ہوگا کہ وقت کا پہیہ کبھی گھوم بھی سکتا ہے۔ آج کے مرد کو اس بات کے لیے تیار رہنا چاہیئے کہ اب یہ پہیہ ہر کچھ سالوں بعد بدلتا رہے گا۔ ورنہ وہ تو ہمیشہ ہی الا پتا رہتا۔۔۔

چاند نگر میں بناؤں گا گھر میں

لیکن۔۔۔۔ او جانے والے بابو، میرے پردیسی سیاں۔۔۔!

اب خوابوں کا زمانہ نہیں۔۔۔ اب تمھیں زمین پر رہ کر ہی اپنا گھر اور نگر بنانا ہوگا۔

کائنات بشیر کا تعلق لاہور سے ہے لیکن گزشتہ کئی سالوں سے جرمنی میں مقیم ہیں۔ مضمون نویسی اور شاعری اِن کا میدان ہے۔ شگفتہ نگاری اِن کی تحریر کا خاصا ہے۔ اندازِ تحریر میں بے تکلفی، بیساختگی اور جامعیت ان کی تحریر میں خاصے تواتر سے دکھائی دیتی ہیں۔ خاصی تندہی سے لکھ رہی ہیں۔ ۲۰۱۳ء میں اِن کی کتاب ''چاند اور صحرا'' شائع ہوئی، مزید بہت سی کتابیں اشاعت پذیر ہیں۔ اخبارات اور رسائل میں باقاعدگی سے لکھ رہی ہیں۔ ''ارمغانِ ابتسام'' کی مستقل لکھنے والوں میں شامل ہیں۔

قندِ شیریں

عامر راہداری

شیقے درزی کا جھمو کے نام آخری خط

ڈیئر سابقہ جان سے پیاری شائلہ عرف جھمو۔۔۔!!

شفیق عرف شیقا درزی آپ کو تہہ دل سے سلام پیش کرتا ہوں۔ یہ خط لکھنے کی کوئی خاص وجہ نہیں ہے بس چند الجھے ہوئے دھاگے ہیں جنہیں فیتا لگا کر سلجھانا چاہتا ہوں اور اس کے بعد یہ درزی آپ کی زندگی سے ہمیشہ کے لیے رفو ہو جائے گا۔ آپ اس خط کو ہمارے رشتے کے پھٹے پرانے لیکر کیتر چولے کا آخری بٹن سمجھئے گا اور یاد رکھیے گا کہ آخری بٹن ٹوٹ جائے تو جوڑا بیکار ہو جاتا ہے۔

پیاری جھمو سب سے پہلے تو میری ایک اہم بات جیب میں ڈال لیجئے کہ آپ میری دوکان کی طرف زیادہ مت آیا کریں کیونکہ استری شدہ سی بات ہے کہ آپ نے مجھ سے بے وفائی کی ہے اور مجھے آپ پہ غصہ ہے۔ اتنا غصہ ہے کہ دل کرتا ہے ابھی آپ کا گریبان پکڑ کر آپ سے پوچھوں کہ شیقے درزی کی محبت میں کیا کمی تھی جو طافو موچی کے ساتھ شادی کے لیے ہاں کر دی۔ نہ صرف ہاں کہہ دی بلکہ مجھے بتانا تک مناسب نہیں سمجھا۔ ڈیئر جان سے پیاری (سابقہ) جھمو میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ طافو موچی میں کون سے ایسے ستارے موتی لگے تھے جو مجھ میں نہیں ہیں۔ آخر شیقا درزی ہی کیوں یہ عشق و عاشقی کی جنگ اور پیار و محبت کی سلائی ہار گیا۔ جھمو آپ کو ایک لمحے کے لئے بھی خیال نہیں آیا کہ جس شیقے نے آپ کی خاطر اپنی دنیا ٹاکی ٹاکی کر دی اس کا کیا ہوگا؟۔ یقین کریں کہ مجھے آپ پر شدید غصہ ہے لیکن اس غصے کے ساتھ ساتھ ایک اور مسئلہ بھی ہے کہ مجھے آپ سے محبت بھی تو شدید تھی۔ ایک ایسی محبت جس میں، میں نے کبھی سلوٹ تک نہیں آنے دی۔ جس محبت کو میں نے ہمیشہ شنیل کی طرح ملائم رکھا۔ میں نے آپ سے میں ایسی محبت کی ہے جس کی مثال پوری تاریخ درزیانہ میں نہیں ملتی۔

ڈیئر جھمو مجھے میری سنگر مشین کی قسم آج بھی آپ کو دیکھ کر دل میں سوئیاں سی چبھنے لگتی ہیں۔ حالانکہ ہمارے اس تعلق کے دھاگے کو ٹوٹے ایک سال ہونے کو آ رہا ہے لیکن آج بھی آپ کو کہیں آتے جاتے دیکھ لوں تو سینے پہ قینچیاں سی چلنے لگتی ہیں۔ دماغ کے سارے دھاگے الجھ سے جاتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے میری مشین کسی اور نے چرالی ہو، میری سوئی سے کسی نے دھاگہ نکال دیا ہو۔ لیکن اس سب کے ساتھ ساتھ ایک نکی نکی سی خوشی بھی ہوتی ہے کہ آپ آج تک میرے ہاتھ کے سلے ہوئے سوٹ پہنتی ہیں، سنیں گلابی سوٹ میں اچھی لگتی ہیں آپ۔۔۔!!

جھمو کیا کمی تھی میری محبت میں؟ میں نے تو اپنی محبت کی سلائی کو مضبوط بنانے کے لیے اس رشتے کے ہر پارٹ میں مٹی کا تیل ڈالا تھا لیکن اس سب کے باوجود آپ نے اس بگرم کے منہ والے طافو موچی کے لیے ہاں کہہ دی۔ وہ طافو موچی جو دو تین سال پہلے یہاں چوک میں ہمارے پھٹے پاٹے جوتے جوڑتا تھا اسے آپ نے اس لئے اپنے ساتھ جوڑ لیا ہے کہ اب اس کی

دوکان کا نام" طافو موچی" کے بجائے "الطاف شو شاپ" ہو گیا ہے اور اس نے گاڑی خرید لی۔ ارے وہ شخص جس نے پوری گلیکسی کے ڈیزائن کھنگال کر آپ کے لئے ساڑھیاں بنائیں آپ اسے ایک گاڑی کی خاطر چھوڑ کر چلی گئیں۔ کیا ہوا جو اس کے پاس پیسے آ گئے ہیں۔ زندگی گزارنے کے لئے صرف پیسے ہی نہیں کپڑے بھی ضروری ہوتے ہیں۔

اور اگر صرف پیسے کی ہی بات کروں تو ڈیئر چھمو میں نے کیا نہیں کیا آپ کو پانے کے لیے۔۔؟ آپ کے ایک سو پینتیس انچ لمبے ابا تک کے کپڑے مفت میں سی کر دیے۔ آپ کی بھابی، آپ کی بھابھی کی بہن بلکہ آپ کی بھابی کی بہن کی بھابھی تک کو سلائی میں کنسیشنیں دیں۔ کتنی بار تو ایک رات میں ہی دو دو سوٹ سی کر دیئے، عید بقرعید پر آپ کی طرف سے آخری وقت بھی سوٹ ملا تو عید سے پہلے پہلے سی کر دیا۔ لیکن اس سب کا صلہ کیا ملا، اس ڈھیلے پاجامے والے طافو موچی کی رقابت۔۔!! کیسے کیسے سپنے سیے تھے میں نے لیکن آپ نے سب کچھ ایک لمحے میں دھاگہ دھاگہ کر دیا۔

خیر میں آپ کا زیادہ ٹائم نہیں لوں گا سیدھا سیدھا بات پہ آتا ہوں کہ آپ نے میرے ساتھ جو دھوکہ کیا ہے اس دھوکے نے مارکیٹ میں میرا کالر نیچا کر دیا ہے۔ میں کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہا۔ ٹکے ٹکے کے کھیسا پھاڑ چھوکرے بھی میرے حال پر باتیں بنانے لگ ہیں۔ جن کی وقعت ابھی پاجامہ سینے کی بھی نہیں ہے وہ بھی میرے گلے کو آ پہنچا ہے۔ خود اپنی حالت کی بات کروں تو کل آپ یاد آ گئیں اور سارا دن سوئی میں دھاگہ نہیں ڈال پایا۔ پچھلے ہفتے جب آپ اپنا عید سوٹ مجھے سینے کے لئے دینے آئیں تو میری حالت خراب ہو گئی، نہ کچھ کھایا نہ سیا۔ چپ چاپ بیٹھا رہ گیا۔ گامو کے بیٹے نے سوٹ سلوانے کے لئے دیا تھا تمہاری یادوں میں اس کی شلوار کی جیب قمیض پر اور قمیض کی جیب شلوار پر لگا دی۔ بے چارہ عید پر سینے زپ لگی جیب لگا کر کتنا عجیب لگے گا۔ چھمو اس سب کی آپ ذمہ دار ہو۔۔!

اس دن آپ جب سوٹ دے کر گئیں میں نے سوچا اس بار اس پر اپنی ساری محنت لگا دوں گا اور آپ سے ایک روپیہ نہیں لوں گا اسی لئے آج آخری روزے کو بھی آپ کا سوٹ بغیر سلائی کے پڑا ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ آج رات آپ کے سوٹ پر اپنا سارا درزیانہ ہنر لگا دوں گا اور ایک ماسٹر پیس تیار کروں گا لیکن ابھی تھوڑی دیر پہلے طافو موچی میری دوکان پہ آیا اور اس نے میرے پا؟ں کے نیچے سے مشین نکال دی۔ اس نے ہزار روپے کو نوٹ رکھ کر کہا:

"چھمو نے جو سوٹ دیا ہے یہ اس کی سلائی ہے جو بقایا بچے عیدی کے طور پر رکھ لینا"

یقین کریں چھمو اگر آپ کا منہ نہ ہوتا تو میں نے اسی وقت اس رزیل کے ترو پے ادھیڑ دینے تھے۔ میں چاہتا تو اسی وقت پیسے اس کے منہ پر مارتا اور اسے دھکے دے کر دوکان سے نکال دیتا لیکن میں بدلہ اس سے نہیں لینا چاہتا تھا۔ میری اس جگ ہنسائی کا سبب آپ بن رہی ہو تو بدلہ بھی آپ سے لینا بنتا ہے۔

ڈیئر جان سے پیاری چھمو اس پیغام کے ساتھ آپ کا سوٹ اور آپ کے طافو کا ہزار روپیہ واپس بھیج رہا ہوں کہ بوجہ درزی کی مرضی آپ کا سوٹ نہیں سل سکتا۔ آپ کسی اور درزی سے سلوا لیں۔ اور ہاں عید کا چاند نظر آ گیا ہے آپ کو شیقے درزی کی طرف سے عید مبارک۔۔!!

آپ کا سابقہ جان سے پیارا شفیق

عامر راہداری کا تعلق لاہور سے ہے اسی باعث لاہوریوں جیسا کھلا ڈھلا اور برجستہ پن ان کی تحریروں میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ پیشے کے لحاظ سے صحافی، آرٹسٹ اور لکھاری ہیں۔ طنز و مزاح لکھنے میں ایک جدا اسلوب کے حامل ہیں۔ عموماً روزمرہ زندگی سے متعلقہ موضوعات کو نشانے پر رکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں۔ "ارمغانِ ابتسام" میں بہت عرصے سے لکھ رہے ہیں، بے قاعدگی غالباً ان کی ہمہ گیر مصروفیات کا شاخسانہ ہے۔

قندِ شیریں

محمد اشفاق ایازؔ

بیگم کا روزہ

نیم سردیوں کی ایک سہ پہر جب میاں لچھن دفتر سے گھر لوٹے تو دیکھا کہ گھر کے دروازے کو خلافِ توقع اندر سے کنڈی نہیں لگائی گئی۔ میاں لچھن بھی دبے پاؤں اندر داخل ہوئے یہ دیکھ کر ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ بیگم صاحبہ مصلے پر بیٹھی تسبیح پڑھ رہی ہیں۔ اپنی نو سالہ ازدواجی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ بیگم لچھن مصلے پر نظر آئی تھیں۔ میاں لچھن کو اچھی طرح یاد تھا کہ یہ مصلہ ان کی ایک سالی نے انہیں شادی کے موقع پر الگ سے تحفہ دیا تھا۔ اس مصلے کی قسمت تقریباً نو سال بعد اب کھلی تھی۔ میاں لچھن نے ایک نظر مصلے پر بیٹھی بیگم کی طرف دیکھا تو بیگم صاحبہ نے بھی پلٹ کر ایک نظر اپنے مجازی خدا کی طرف دیکھا جو حیرت میں گم ابھی تک کھڑا مصلے کی تنگ دامنی اور بیگم کے وسیع دامن پر غور کر رہا تھا۔

بیگم نے ہولے سے مسکراتے ہوئے منہ پر ہاتھ رکھا۔ میاں لچھن ذرا قریب گئے اور پوچھا ''گھر میں سب خیر تو ہے ناں؟''

''ہاں سب خیر ہے'' بیگم نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا

''کہیں کوئی خوشخبری تو نہیں؟'' میاں لچھن مصلے کے نزدیک ہی فرش بیٹھتے ہوئے بولے۔ وہ اس خیال میں تھے کہ شائد خدا نے اُن کی دوسری بار سن لی ہو۔ اُن کی پہلی اولاد میاں لچھن اپنی سوکھی ٹانگوں کے ساتھ دنیا میں تشریف لائے ماشاء اللہ ساڑھے سات سال کے ہو چکے تھے۔ وقفہ اچھی چیز ہے لیکن میاں لچھن کے بعد یہ کچھ زیادہ ہی لمبا ہو گیا تھا جس سے قریبی رشتہ داروں میں میاں لچھن کی صحت کے بارے میں بعض ''نازیبا'' قسم کی چہ میگوئیاں بڑے زور و شور سے جاری تھیں۔ اسی وجہ سے انہوں نے سسرال میں بھی جانا بہت کم کر دیا ہوا تھا۔

''جی تو لچھن کے بعد کوئی بجن، ججی وغیرہ وغیرہ ؟''۔ میاں لچھن نے جھکتے ہوئے منہ بیگم کے کان کے قریب کرتے ہوئے کہا، حالانکہ اس وقت گھر میں کوئی دوسرا ان کی گفتگو سننے والا موجود نہیں تھا۔

''ہائے ہائے وغیرہ وغیرہ کیا ہوا؟ میں کوئی چوہیا یا بکری ہوں جو ایک دم سے تین چار کی لائن لگا دوں گی؟''

بیگم نے انہیں پرے ہٹاتے ہوئے کہا ''میری تو دعا ہے کہ بس ایک ہی اور آ جائے۔ اپنے لچھن کی جوڑی بھی بن جائے گی اور لوگوں کے منہ بھی بند ہو جائیں گے۔''

''نہیں نہیں چوہیا یا بکری ہوں تمہارے دشمن۔ تم تو ماشاء اللہ بھینس کالونی سے آئی ہو۔'' میاں لچھن مزید جھکتے ہوئے بولے۔

یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ میاں لچھن نے اپنے سسرالی گھر

کو بھینس کالونی کا نام دے رکھا تھا۔ وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ شادی کے بعد جب پہلی دفعہ وہ اپنے سسرال گئے تو پتہ چلا کہ ان کی بیگم اپنے اسی کلووزن کے باوجود ان سب میں سمارٹ ہے۔ لیکن ان کی ساس صاحبہ، تین چار سالیاں اور کچھ دیگر قریبی رشتہ دار خواتین واقعی ''کھاتے پیتے'' گھرانے کی لگتی تھیں۔ ان میں سے کسی کا وزن ایک سو کلوگرام سے کم نہ تھا۔ انہیں دیکھ کر میاں لچھن کے منہ سے بے ساختہ نکلا ''لگتا ہے میں بھینس کالونی میں آ گیا ہوں''۔ وہ تو خیر ہوئی کسی نے سنا نہیں۔ ورنہ کوئی ایک بھینس انہیں اپنے پاؤں تلے روند دیتی تو میاں لچھن ساری عمر لاٹھی کے سہارے چلتے نظر آتے۔

''لوجی دعا کرنا تو اچھی بات ہے۔ اللہ کریم قبول فرمائے۔'' میاں لچھن بولے ''تو پھر آج سے آپ نے نماز پابندی سے پڑھنے کا سوچا ہے؟''۔

''جی میں نے سوچا ہے کہ اس دفعہ میں بھی روزہ رکھوں گی؟'' بیگم نے یوں کہا، جیسے اعلانِ جنگ کر رہی ہوں۔

''لیکن بیگم صاحبہ رمضان شروع ہونے میں ابھی پورا ایک ماہ باقی ہے۔''

''تو کیا ہوا۔۔۔۔ تیاری ابھی سے کریں گے تو روزہ رکھا جائے گا ناں!''

''روزہ یا روزے؟ مگر کس خوشی میں؟۔ اس سے پہلے تو کبھی اس گھر میں ایسا نہیں ہوا۔ شادی کے دوسرے دن تمہاری اماں نے سختی سے ہدایت کی تھی کہ دلہنیا کو ہر دو تین گھنٹے بعد کچھ نہ کچھ کھانے کی عادت ہے۔ میں تو آج تک انہی کی بات کا پالن کرتا آ رہا ہوں۔''

''میں روزہ رکھ کر دعا مانگوں گی۔ شائد اسی کی برکت سے میری گود دوسری بار ہری ہو جائے۔''

''بیگم ایک بات بتاؤ کیا تمہارا خاندان گرگٹ کی نسل سے بھی تعلق رکھتا ہے؟''

''کیا مطلب؟'' بیگم صاحبہ کے چہرے پر ناراضگی اور غصے کے آثار نمودار ہونے لگے۔

ہم بشیر بدر کے ذاتی طور پر ممنون ہیں کہ اُنہوں نے اپنی تعریف میں ہمارے دو جملے نقل کیے ہیں اور اُن سے پہلے یہ لکھا ہے ''کراچی کے خطرناک خامہ بگوش کا خیال ہے کہ۔۔۔۔''۔ معلوم نہیں اُنہوں نے کس بناء پر ہمارے نام کے ساتھ ''خطرناک'' کا سابقہ استعمال کیا ہے حالانکہ جب ہم کسی کی تعریف کرتے ہیں تو ''سادہ لوح'' کی پھبتی کے مستحق ہوتے ہیں۔
خامہ بگوش از مشفق خواجہ

''بات دراصل یہ ہے کہ زندگی میں تم نے سوائے رنگ بدلنے کے اور کیا ہی کیا ہے۔ شادی سے پہلے تم ہاتھ پیلے ہونے کی دعا مانگا کرتی تھیں۔ شادی کے بعد اکثر غصے سے لال پیلی ہو جاتی ہو اور اب گود ہری کرنا چاہتی ہو۔ پھر اس کے بعد شائد تم۔۔۔''

''میں نے کہا ناں کہ میں روزہ رکھوں گی اور بس۔ اب میرا ارادہ کوئی نہیں بدل سکتا!''

''اچھا جی تو وضاحت فرما دیجئے کہ کتنے روزے رکھیں گی۔ پورے رمضان کے یا کچھ کم؟''

''جی ابھی رمضان کا صرف ایک روزہ رکھنے کا پکا ارادہ ہے۔'' بیگم صاحبہ فیصلہ کن انداز سے بولیں ''اب میرا ارادہ کوئی نہیں بدل سکتا۔''

''ویسے میرا خیال ہے اگر تم رمضان کے پورے روزے رکھو تو اللہ تمہاری دعا بھی ضرور سنے گا اور اس سے ہمارے گھریلو بجٹ میں پورے نصف تنخواہ کی بچت ہو سکتی ہے۔''

''اس کا مطلب ہے آپ کو میری بات کی سمجھ نہیں آئی!'' بیگم بولیں۔

میاں لچھن خوب اچھی طرح جانتے تھے کہ جب گفتگو ان الفاظ پر آ جاتی ہے تو اس سے آگے کیا ہوتا ہے۔ پھر بات بیگم کے منہ سے نہیں نکلتی بلکہ وہ اپنے ہاتھوں سے سمجھاتی ہیں۔ اس سے پہلے کہ بات منہ کی بجائے ہاتھوں سے سمجھانے کی نوبت آتی، میاں لچھن فوراً بولے ''بیگم ناراض نہ ہوں۔ میرے کہنے کا مطلب بلکہ مقصد یہ تھا کہ میرے لئے کیا حکم ہے۔ کیا مجھے بھی آپ کے

ساتھ روزہ رکھنا پڑے گا۔"

"آپ روزہ رکھیں یا نہ۔ میں تو ضرور رکھوں گی۔ اللہ بخشے ابا میاں کو۔ اماں جب رمضان سے دو ماہ قبل روزہ رکھنے کا ارادہ کرتیں تو ابا میاں تین چار کلو بادام، میوہ، گری اور پستہ لے آتے۔ پھر اماں روز رات کو تھوڑے سے ایک کلو دودھ میں بھگو دیتیں اور صبح اس سے ناشتہ کرتیں۔۔۔ اللہ بخشے ابا میاں اماں کا کتنا خیال رکھتے تھے۔"

"دو ماہ پہلے۔۔۔ اتنا سارا کھابا۔۔۔ دودھ۔" اب پھپھن میاں کی جان نکلنا شروع ہوگئی۔ انہیں یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ طالبان یا داعش کی قید میں ہیں اور انہیں ٹکٹکی سے باندھ کر سر پر ہتھوڑے سے ضربیں لگائی جارہی ہیں۔

میاں پھپھن کو جیسے چپ لگ گئی۔ لیکن ان کی بیگم سر جھکائے مسلسل اپنے ابا کی فضیلت اور اماں سے پیار کی کہانی بیان کرتے ہوئے کبھی کبھی کن انکھیوں سے میاں پھپھن کی طرف بھی دیکھ رہی تھیں۔ پیار سے نہیں بلکہ ان کا ردعمل معلوم کرنے کے لئے۔ ایک روزے کے اتنے لوازمات کا سن کر میاں پھپھن کے ہوش اڑتے جا رہے تھے۔

"اور ہاں۔۔۔ جس دن اماں نے روزہ رکھنا تھا۔ اللہ بخشے ابا میاں نے رات کو ہی رکشے والے کو پابند کرلیا تھا کہ سحری سے ایک ڈیڑھ گھنٹہ پہلے آجائے۔ انہوں نے سپیشل کچوریوں، پھینیوں دو کلو دودھ، آدھ کلو دہی، کا آرڈر دے رکھا تھا۔ بادام الگ سے بھگو کر رکھے ہوئے تھے۔ پھر اس دن اللہ بخشے ابا میاں اپنی دکان پر بھی نہیں گئے۔"

"بیگم آپ کی اماں حضور نے کس تاریخ کو روزہ رکھا تھا؟" میاں پھپھن نے حواس قائم کرتے ہوئے پوچھا۔

"اماں نے ؟۔۔۔ ہاں اس دن رمضان کا بیسواں روزہ تھا۔" بیگم نے خاص انداز سے کہا۔

"گویا وہ ایک روزے کے لئے پورے اڑھائی ماہ بادام، پستہ دودھ پر پلتی رہیں۔ اچھا تو آپ اپنا روزہ کب رکھیں گی۔"

"میرا ارادہ ہے میں ستائیسویں رمضان کو روزہ رکھوں۔

> ہمیں تو ابھی چند روز پہلے پتہ چلا ہے کہ ہمارے ایک سابق وزیرِ اعظم کو دل کی بیماری اس نرس سے لگی جو آخری عمر میں اُن کی تیمارداری پر متعین تھی۔
>
> **نوک جھوک از ڈاکٹر محمد یونس بٹ**

مبارک رات کا روزہ۔۔۔ اللہ ضرور قبول کرے گا۔ اور میری دعا ضرور قبول ہوگی۔"

"تو گویا آپ بھی پورا ڈیڑھ ماہ ایک روزے کی خاطر میری جمع پونجی پر ہاتھ صاف کرتی رہیں گی؟"

"جس دن اماں نے روزہ رکھا۔" بیگم نے میاں پھپھن کی بات ان سنی کرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی "اس دن ابا میاں دکان پر نہیں گئے۔ ادھر اماں روزہ رکھتے ہی اپنے پلنگ پر لیٹ گئیں۔ اُدھر اللہ بخشے ابا میاں پلنگ کے قریب کرسی کر کے بیٹھ گئے۔ اور اماں کا ہاتھ پکڑ کر انہیں دلاسہ دیتے رہے۔ کچھ دیر بعد ہی اماں کو نیند آگئی مگر مجال ہے جو ابا میاں ذرا بھی اونگھے ہوں۔ بس اماں کے ہاتھ پکڑ کر انہیں سہلاتے رہے۔ گھر میں جیسے کرفیو کا سماں تھا۔ بچوں کو حکم تھا کہ کوئی شور نہ کرے مبادا اماں کے آرام میں خلل پڑے۔"

"اور ابا شام تک ایسے ہی پلنگ سے چپٹے بیٹھے رہے؟"

"جی نہیں۔ اماں تو سارا دن ہی سوتی رہتیں لیکن جب دو گھنٹے بعد ہی بجلی چلی گئی تو گرمی کی وجہ سے اماں کی آنکھ کھل گئی۔ ابا میاں بہت پریشان ہوئے۔ فوراً گلی میں گئے۔ یہ تسلی کرنے کہ سارے محلے کی بجلی گئی ہے یا صرف ان کے گھر کا فیوز اڑ گیا ہے۔ انہوں نے دیکھا گلی کے سرے پر دو آدمی بجلی کے کھمبے پر چڑھے ہوئے ہیں۔ اور ایک نیچے کھڑا انہیں ہدایات دے رہا ہے۔ ابا میاں ان کے پاس گئے معاملہ پوچھا تو پتہ چلا بجلی کی تاریں تبدیل کی جارہی ہیں۔ بجلی بحال ہونے میں کم از کم چار پانچ گھنٹے لگیں گے۔ ابا میاں واپس گھر آئے۔ اماں کا گرمی سے برا حال ہو رہا تھا۔ ابا میاں انہیں اپنے ہاتھ سے پنکھا جھل رہے تھے۔ لیکن اماں کو چین کہاں۔ گرمی سے پسینہ آیا تو پیاس لگنا شروع ہوگئی۔ ابا میاں نے گزشتہ شام بس تھوڑا سا کھایا تھا اور سحری کے وقت تو کچھ بھی نہیں۔

وہ جو ڈھیر سارا مال بازار سے لائے تھے اماں کے لئے ہی کافی تھا۔بس اماں کو کھاتا ہوئے دیکھتے رہے۔‘‘

بیگم کی داستان میاں پھمن کے اعصاب کو بری طرح گھائل کر رہی تھی۔ بیگم کچھ اور منصوبہ سازی کر رہی تھی اور میاں پھمن اندر ہی اندر گھلے جا رہے تھے۔ انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کسی بادشاہ کے دربار میں ایک خطرناک مجرم کی حیثیت سے کھڑے ہیں اور ان کے جسم سے آہستہ آہستہ کھال کھینچی جا رہی ہے۔ انہیں بیگم کے منصوبے سے فرار کا کوئی راستہ نظر نہیں آر ہا تھا۔اب یہ بھی کوئی بات ہوئی صرف ایک روزے کے لئے ان کی ماں اڑھائی ماہ تک عیاشی کرتی رہے اور اب بیٹی ایک روزے کے لئے پورے ڈیڑھ ماہ ان کا خون چوستی رہے۔ میاں پھمن کا پیمانہ صبر لبریز ہوتا جا رہا تھا۔لیکن بیگم کی داستان ابھی باقی تھی۔

’’ابھی دن کے گیارہ ہی بجے تھے کہ اماں نے پلنگ سے اٹھنے کی کوشش کی۔ ابا نے انہیں سہارا دے کر اٹھانے کی کوشش کی لیکن وہ پیاس سے نڈھال ہو کر گر پڑیں۔ اللہ بخشے ابا کے منہ سے چیخ نکلی۔ گھر کے سب افراد دوڑ کر پلنگ کے قریب اکٹھے ہو گئے۔ ابا میاں کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ دوڑ کر فریج میں رکھے فریش جوس کا گلاس بھر کر لائے۔ اماں کے ہونٹوں سے لگایا۔ اماں کی آنکھیں ذرا سی کھلیں۔

’’میری بانو تمہارا روزہ ہو گیا۔لو جوس پی لو۔تمہارا روزہ ہو گیا۔‘‘ ابا میاں نے اماں کے سر کو سہارا دے کر اوپر کیا اور اماں نے جوس کا گلاس ایک ہی سانس میں پی لیا تو ابا میاں کی بھی جان میں جان آئی۔ آدھے دن کا روزہ سہی لیکن اماں نے جو کوشش کی تھی اللہ بخشے ابا میاں اس پر بہت خوش تھے۔ اگر اس وقت ابا میاں، اماں کو جوس نہ پلاتے تو آج ہم ماں کے سائے سے محروم ہو چکے ہوتے۔‘‘

میاں پھمن کو تھوڑی تھوڑی سمجھ آنے لگی کہ ان کی بیگم کی اماں روزے کا بہانہ کر کے کیسے اپنے شوہر کی سادگی سے فائدہ اٹھا کر ان کو بے وقوف بناتی رہی تھی۔ اب یہی چال ان کی بیگم چلنے جا رہی تھی۔

’’ماشاءاللہ آپ میں تو جان ہے آپ تو پورے دن کا روزہ رکھیں گی ناں؟‘‘۔ میاں پھمن نے انہیں پکا کرتے ہوئے کہا۔

’’اس وقت تو ابا تھے جنہوں نے اماں کا نصف دن تک خیال رکھا۔ آپ تو سارا دن دفتر میں ہوتے ہیں۔ اسی لئے میں نے اپنی اماں اور دونوں بہنوں کو بلا لیا ہے۔ وہ رمضان سے پندرہ دن پہلے آ جائیں گی۔ ان کے ہوتے ہوئے مجھے ستائیسویں کا روزہ رکھتے ہوئے کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔۔۔۔ اللہ بخشے ابا۔۔۔۔‘‘

’’جہنم میں گئے تمہارے اللہ بخشے ابا میاں۔‘‘ میاں پھمن میں یک دم جان آ گئی۔ غصے سے ان کا چہرہ لال ہو گیا۔ بیگم پھمن نے انہیں نو سال میں اتنے غصے میں نہیں دیکھا تھا ’’تم نے ایک روزہ رکھنا ہے اور میں ڈیڑھ ماہ تک تین بھینسوں کا خرچہ اٹھاؤں۔ خبردار جو تم نے روزے کی بات کی۔ آج سے تمہارا خرچہ بند۔ میں کل ہی تمہیں تمہاری ماں کے گھر چھوڑ آتا ہوں۔ وہاں سب تمہارا خیال رکھیں گے۔ جتنے دن کا مرضی روزہ رکھنا۔ میرے لئے اکیلا اللہ اور اکلوتا پھمن ہی کافی ہیں۔‘‘

میاں پھمن کو اس قدر غصے میں دیکھ کر بیگم پھمن اپنے سارے منصوبے بھول گئیں۔ میاں پھمن غصے میں گھر سے باہر چلے گئے۔ دوسرے دن میاں پھمن دفتر نہیں گئے۔ انہوں نے کار کرائے پر لی اور بیگم کے معافی مانگنے اور اس یقین دہانی کے باوجود کہ وہ آئندہ روزہ رکھنے کا سوچیں گی بھی نہیں، انہوں نے بیگم کو مع باؤ پھمن کار میں بٹھایا اور انہیں بھینس کالونی یعنی سسرال چھوڑ آئے۔

محمد اشفاق ایاز کا تعلق جلالپور جٹاں (گجرات) سے ہے۔ اُردو اور پنجابی میں لکھتے ہیں۔ سنجیدہ نثر نگاری کا سفر پاکستان کے مختلف جرائد و اخبارات سے ہوتا ہوا ماہنامہ ’’چاند‘‘ اور ’’زیرِ لب‘‘ میں مزاحیہ نثر نگاری تک جا پہنچا۔ ایک آدھ تحریر ’’اردو ڈائجسٹ‘‘ میں بھی دیکھی گئی۔ انگریزی تحریروں کو اُردو میں بھی منتقل کیا۔ افسانے بھی تخلیق کیے۔ موڈ اچھا ہو تو شاعری میں بھی لفظ جوڑ لیتے ہیں۔ ویب سائٹ vojpj.com کے ایڈیٹر ہیں۔

نیاز محمود

چاند

اُردو ادب میں محبوب کے لیے چاند کا استعارہ باندھا جاتا ہے اور صیغۂ مذکر میں اسے یاد کیا جاتا ہے۔ ہر کسی کا اپنا اپنا چاند ہوتا ہے۔۔۔ کسی کا چاند دبلا پتلا اور کسی کا موٹا ہوتا ہے۔ چاند دبلا پتلا ہو یا موٹا نظر ضرور آتا ہے۔ کچھ لوگوں کے ہاں نظر آنے کے لیے چاند کا موٹا ہونا ضروری ہے، یعنی جو موٹا نہ ہو وہ اور کچھ ہو نہ ہو، چاند ہرگز نہیں ہوگا۔

ہمارے ہاں چاند کے لیے الگ معیارات مقرر ہیں. ہمارا چاند سب سے الگ تھلگ اور نمایاں ہونا ضروری ہے، اسی طرح ہمارا چاند اکیلا ہی نکلے گا، پڑوسیوں، دوست احباب اور باقی دنیا کے چاند کے ساتھ نکلنے والا چاند ہمارا چاند نہیں۔ ہمارا چاند ہماری طرح نرالا اور اکیلا ہے۔۔۔ جو ہمارے چاند کو اپنا چاند نہیں مانتے ہم ان کو ہی نہیں مانتے۔

چاند خوبصورت ہو نہ ہو اس کے حسن کے چرچے ہوا کرتے ہیں، یہاں تک کہ چاند کے چہرے پر موجود داغ بھی حسن کے زمرے میں شمار ہوتے ہیں، یوں ہماری چاہت چاند کو اتنا مغرور بنا دیتی ہے کہ وہ آسمان کو چھونے لگتا ہے۔

ایک چاند آسمان پر بھی ہوتا ہے، یہ جسامت میں گول ہوتا ہے اور زمین کے گرد چکر لگاتا ہے۔ یہ چاند اپنے مرکز زمین کے ساتھ سورج کے گرد بھی گھومتا ہے جس سے موسموں اور شب و روز کی پیدائش ممکن ہو جاتی ہے۔ موسموں کے تغیر و تبدل کے ساتھ اسلامی مہینوں کا حساب کتاب بھی اسی چاند کے مرہون منت ہے۔ چاند اور زمین کی سورج کے گرد گردش کے دوران ایسے مواقع بھی آتے ہیں جب زمین سورج اور چاند کے درمیان آجاتی ہے، جس سے زمین کا سایہ چاند پر گرتا ہے اور چاند کی روشنی ماند پڑ جاتی ہے یا پھر چاند مکمل تاریک ہو جاتا ہے جسے چاند گرہن کا نام دیا جاتا ہے۔ اسی طرح جب چاند سورج اور زمین کے درمیان آجاتا ہے تو چاند کا سایہ زمین کے جس حصے پر پڑتا ہے وہاں سورج گرہن نظر آتا ہے۔ سائنس و ٹیکنالوجی کی مدد سے انسان سیکنڈز کے حساب سے چاند اور سورج گرہن کا دورانیہ بتا سکتا ہے علاوہ ازیں یہ صلاحیت بھی رکھتا ہے کہ کون سے علاقے میں یہ گرہن کب اور کس تناسب سے ہوگا۔

چاند زمین سورج اور دوسرے سیاروں ستاروں کے درمیاں موجود فاصلے کا تعین بھی اب انسان کے دسترس میں ہے۔ یہ نہیں انسان اب پیشگی کائنات میں رونما ہونے والے واقعات سے آگاہی کی طاقت رکھتا ہے۔ چاند اور زمین کی اسی گردش سے چاند کی سطح پر سورج کی روشنی کا زمین پہ مختلف زاویوں سے مشاہدہ کیا جا سکتا ہے، یہی مشاہدہ چاند کی روشن سطح کی مختلف صورتوں وضع کرتا ہے اور انہی مختلف صورتوں کی بنیاد پر اسلامی مہینے کی پیدائش اور دورانیہ متعین ہوتا ہے۔ چاند کو اس عمل میں ۲۹ دن اور کچھ منٹ لگتے ہیں، اسی طرح سورج کے گرد چکر لگانے میں ۳۵۵ دن صرف ہوتے ہیں، جو عیسوی سال سے دس دن کم ہیں۔

محبوب اور آسمان والے چاند کے علاوہ کچھ چاند اور بھی

ہوتے ہیں، جیسے رمضان کا چاند، عید کا چاند۔۔۔عید کے بھی پھر دو چاند ہوتے ہیں۔۔۔یہ چاند خاص قسم کے چاند ہوتے ہیں اور کسی کسی کو دکھائی دیتے ہیں۔۔۔انہیں دیکھنے کے لیے کافی جتن کرنے پڑتے ہیں۔ یہ انتہائی خوبصورت ہوتے ہیں اور ہر نئے دن کے ساتھ ان کی خوبصورتی میں کمی آتی ہے۔ کہتے ہیں کہ اس کی عمر جتنی کم ہوگی اتنی ہی اس کی خوبصورتی زیادہ ہوگی۔ اس کی مکمل خوبصورتی تو شاید ہی کوئی دیکھ سکتا ہو البتہ ہر کسی کی کوشش ہوتی ہے کہ سب سے پہلے وہی اس کے درشن کرے۔ اپنی پیدائش کے کچھ عرصہ بعد یہ چاند تھوڑے وقت کے لیے سورج کے غروب ہوتے ہی اپنے درشن کراتا ہے لیکن اس کے لیے وقت اور سمت کا درست اندازہ ہونا لازمی ہے۔

پوری دنیا کی طرح ہمارے ہاں بھی چاند اپنے درشن کراتا ہے۔ پاکستان میں چونکہ اس کے چاہنے والے زیادہ ہیں اور ایک دن میں سب کو شرف ملاقات بخشنا ممکن نہیں ہوتا لہٰذا جو پاکستانی (پشاور اور اس کے مضافاتی علاقوں کے باشندگان کے علاوہ) اس کو دیکھ نہیں پاتے ان کے لیے دوسرے دن اور کبھی کبھار زیادہ رش کی وجہ سے تیسرے روز بھی نکلتا ہے، پاکستان، مرکزی رویت ہلال کمیٹی اور حکومت سے اس کی دلی وابستگی اور عقیدت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ پوری دنیا کے لیے صرف ایک دن ملاقات کا رکھا گیا ہے لیکن پاکستان کے لیے الگ سے ایک دن مقرر ہے اور کیوں نہ ہو پاکستانی ماشاء اللہ انتہائی صابر قوم ہے، ایک دن صبر کر لیتی ہے اور دوسرے دن آرام سے شرف ملاقات حاصل کر لیتے ہیں اور اس ملاقات کا نہ صرف دورانیہ دوچند ہوتا ہے بلکہ چاند اپنے رخ سے پردہ بھی نسبتاً زیادہ ہٹا دیتا ہے، یوں زیادہ سے زیادہ لوگ اس کی ملاقات سے مستفید ہوتے ہیں لیکن پوری دنیا اور خاص کر پاکستان کے اندر ایک طبقے کو پاکستان کا یہ مقام و مرتبہ ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ اب آپ ہی فیصلہ کریں کیا درست ہے اور کیا غلط لیکن چھوڑیں آرام سے بیٹھ جائیں، آپ کے ہمارے فیصلے سے ہوگا کچھ بھی نہیں۔

نیاز محمود صاحب کا تعلق ''چھوٹا لاہور'' صوابی سے ہے۔ ہزارہ یونیورسٹی مانسہرہ سے ایم۔فل کیا ہے، مقالے کا عنوان تھا ''قدرت اللہ شہاب کی نثر کے فنی محاسن''۔ ناردرن یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی جاری ہے۔ درس و تدریس سے وابستہ ہیں۔ انشائیہ اور افسانہ نگاری میں خصوصی دلچسپی ہے۔ طنز و مزاح سے بھی فطری رغبت ہے جو انہیں ''ارمغانِ ابتسام'' کی طرف لے آئی ہے۔ معاشرے کے عمومی موضوعات کو طنز و مزاح کی خصوصی عینک سے دیکھنا ان کی تحریر کا امتیازی نشان ہے۔

چند کمینوں کے خطوط

خادم حسین مجاہدؔ

غالبؔ نے ایک شعر میں اپنے ترکے میں شامل ایک اہم چیز کا ذکر "چند حسینوں کے خطوط" کے نام سے کیا ہے۔ یہ قیامت کے نامے تقریباً ہر ایک کو جوانی میں ملتے ہیں، جنہیں وہ ساری عمر سینے سے لگا کر رکھتا ہے، ہاں البتہ بعض صورتوں میں وہ آگ میں بھی جھونک دیے جاتے ہیں، اگر اسی قیامت سے شادی ہو جائے یا وہ بیگم کے ہتھے چڑھ جائیں لیکن اگر وہ محفوظ بھی رہیں تو کوئی اُن کو منظرِ عام پر لانا پسند نہیں کرتا، اس کے برعکس کچھ کمینوں کے خطوط بھی ہوتے ہیں جو لنگوٹیے یا بے تکلف دوستوں کے قلم کا شاخسانہ ہوتے ہیں۔ حسینوں کے خطوط کی طرح اِن کا افشا بھی اپنی عزت چوراہے میں رکھنے کی بات ہے لیکن آپ کی تفریحِ طبع کے لئے ہم ایسے خطوط کے بعض حصے سنسر کر کے آپ کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔ ماضی میں جب خط لکھنا روٹین کی بات تھی، آپ نے بھی کچھ نہ کچھ ایسے خطوط وصول کیے ہوں گے، اس لئے امید ہے کہ آپ ان سے لطف اندوز ہوں گے۔

۱

"آپ نے اندھوں کی تنظیم چلانے کے لئے قربانی کی کھال مانگی ہے، اے کاش آپ نے دل مانگا ہوتا تو ہم محبوباؤں سے بچا کر آپ کے حوالے کر دیتے مگر کھال ایک خریدار کئی یعنی ایک انار سو بیمار والا قصہ ہے اور جس کو کھال نہ دیں، وہ ویسے کھال کھینچنے کی دھمکی دیتا ہے۔ ویسے ایک کھال اور بھی ہے جو کہ مذکر ہوتا ہے اور اس کا تعلق کسانوں سے ہوتا ہے اور کھائی اس کی بہن ہوتی ہے۔ آپ بھی دھیان میں رکھیئے گا کہ کھال کی جگہ کوئی کھائی متھے نہ لگ جائے۔ اگر ایسا ہوا تو کھوہ (کنواں) بھی زور آزمائی کرے گا تاکہ اس کی برتری کھائی پر قائم رہ سکے لیکن اس دھینگا مشتی میں کھالیں دونوں کی اُتر جائیں گی جو آپ کے کام آ سکتی ہیں، انہیں پر گزارہ کریں اور ہمیں معاف رکھیں۔"

۲

"آپ نے ہیر وارث شاہ قصے کے ہیرو رانجھے کی جنم بھومی تخت ہزارہ کے بارے میں پوچھا ہے تو تخت ہزارے میں "رانجھا" قوم کا کوئی فرد نہیں پایا جاتا، دیگر دیہاتوں میں جو تخت ہزارے کے آس پاس ہیں، وہاں رانجھے کافی مقدار میں پائے جاتے ہیں اور ان میں رانجھے کی خصوصیات بھی وافر ملتی ہیں مگر حیرت ہے کہ خاص تخت ہزارے میں رانجھے کے آبا و اجداد کا کوئی سراغ نہیں ملتا اور آل اولاد کا کھرا اس لئے نہیں مل سکتا کہ رانجھے کی شادی ہی کب ہوئی، اس لئے مجھے تو یہ داستان گو کی گپ ہی لگتی ہے، دراصل

تخت ہزارہ قدیم ترین علاقہ ہے جس کا ذکر تاریخ میں بھی ملتا ہے، اسی شہرت کے باعث داستان گو نے یہاں سے رانجھے کا کردار گھڑا ہوگا۔ اس علاقے میں تخت ہزارہ چھوڑ کر یہ قوم وافر تعداد میں پائی جاتی ہے البتہ یہاں ایک چھوٹی سی مسجد میاں رانجھے سے منسوب موجود ہے، جس کا حال بھی ملک کے حال جیسا ہی ہے اس لئے رانجھے کے تعلق سے جو لوگ ہیر کا متوقع سسرال ڈھونڈنے یہاں آتے ہیں، جب انہیں مایوسی ہوتی ہے تو اس مسجد کو دیکھ کر اور یہاں تصویریں بنا کر وہ اپنا کرایہ پورا کر کے چلے جاتے ہیں۔ بعض سائنسدان قسم کے سیاح یہاں کی مٹی سے رانجھے کی بو یا خوشبو سونگھنے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ مزید ریسرچ کے لئے مٹی ساتھ بھی لے جاتے ہیں اس لئے مقامی لوگ سوچ رہے ہیں کہ پیکنگ کر کے مٹی کی قیمت مقرر کر دی جائے اور اس سے ہونے والی آمدن سے مسجد کے حالات درست کیے جائیں کیونکہ نماز پڑھنے تو وہاں کوئی آتا نہیں، چندہ کوئی کیا دے گا۔ ممکن ہے اس سے کچھ اور گھروں کے حالات بھی درست ہو جائیں۔ میں نہیں جانتا کہ اس عمل کی شرعی حیثیت کیا بنے گی کہ دھوکے سے حاصل کردہ رقم مسجد پر لگانی جائز بھی ہوگی کہ نہیں لیکن منفی کے ساتھ ساتھ اس کا مثبت پہلو بھی تو ہے کہ خانہ خدا آباد ہو جائے گا اور یہاں سیاحوں کے ٹھہرنے کے لئے کوئی عمارت بن جائے گی کیونکہ گاؤں میں ہوٹل وغیرہ کا تصور ہی محال ہے اور لوگوں کے کچے گھر سیاحوں کے ٹھہرانے کے لئے موزوں نہیں۔ دیگر انہوں نے یہ بھی سوچا ہے کہ رانجھے کے جھوٹے سچے حالات پر کوئی کتابچہ بھی شائع کرا دیا جائے جو یہاں آنے والے سیاحوں کو مہنگے داموں بیچ کر رقم مذکورہ پروجیکٹ میں لگا دی جائے، دیکھا، جہاں شہریوں کے سبز قدم پڑے، وہاں کے لوگوں کی سوچ ہی کمرشل ہوگئی، ویسے آپس کی بات ہے، میری تحقیق کے مطابق اس مسجد کا بھی رانجھے سے اتنا ہی تعلق ہے جتنا ہماری پولیس کا امن وامان سے ہوتا ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ ہیر کے قصے میں تخت ہزارہ کے ساتھ رانجھے کا ذکر پڑھ کر کسی مقامی درویش نے رانجھے کے نام سے مسجد تو بنادی لیکن اس کی آباد کاری یا توسیع کی کوئی کوشش نہ کی جس کی وجہ سے یہ برسوں سے ایک ہی حالت پر قائم ہے۔ گاؤں کے بڑے تخت ہزارے کے ساتھ رانجھے کے ذکر کو پسند نہیں کرتے کیونکہ ان کے خیال میں کوئی رانجھا تھا بھی تو اس نے اپنی حرکتوں سے تخت ہزارہ کو بدنام ہی کیا ہے اس لئے اگر کبھی آپ یہاں کا قصد کریں بھی تو کسی مقامی آدمی کو ضرور ساتھ لے لیں اور کسی بزرگ سے رانجھے کی تاریخ پوچھنے کی کوشش نہ کریں ورنہ ہوسکتا ہے کہ وہ آپ کا جغرافیہ بگاڑ دے۔ البتہ صرف یہاں کا ہی نہیں بلکہ آس پاس کا ہر نوجوان بھی رانجھے کے نقشِ قدم پر چلنے کا آرزومند ہے بلکہ چند ایک تو جھنگ کے سیالوں سے اسی چکر میں مار بھی کھا کر آچکے ہیں کہ کوئی اور ہیر پٹا لیں۔ اس لئے اگر آپ یہاں آئے تو کئی نوجوان آپ کے ساتھ چلنے پر تیار ہو جائیں گے، ان سے محتاط رہئے گا ورنہ لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔''

۳

''تم نے لکھا ہے کہ شادی کے بعد تمھاری دنیا بدل گئی ہے حالانکہ ہم نے سنا ہے کہ شادی کے بعد دن رات بدل جاتے ہیں۔ لوگ شادی کے فنکشن میں کھسروں یا کنجروں کو بلاتے ہیں، تم نے شاعروں ادیبوں کو بلوایا ہوا تھا۔ ادیب تو پھر بھی پرامن ہوتے ہیں کہ اپنی لمبی چوڑی تحریر یاد نہیں رکھ سکتے مگر شاعروں نے منہ زبانی شاعری کی بمباری سے بھیجا ہلا دیا۔ واپسی میں ایک ہوادار ڈبے میں سفر کے باعث بخار ہوگیا، اب میں وہ ڈبہ بھلا کیسے چھوڑ سکتا تھا جس میں ایک خوبصورت لڑکی موجود تھی اور لائن بھی دے رہی تھی۔''

خادم حسین مجاہد کا تعلق سرگودھا سے ہے۔ موصوف بچپن سے ہی لکھتے آرہے ہیں۔ بچوں کے لئے بہت کچھ لکھا۔ شستہ اندازِ تحریر کے مالک ہیں۔ ظرافت نگاری کے ساتھ ساتھ ان کے طنز کی کاٹ سے بھی انکار ممکن نہیں۔ بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ''ارمغانِ ابتسام'' کی مجلسِ مشاورت میں شامل ہیں اور اوّلین شمارے سے اس کے ساتھ ہیں۔

گوہر رحمٰن گہر مردانوی

متشاعر

ادب کی آبیاری ہمیشہ باادب لوگوں نے کی اور ایسی نادر روزگار ہستیاں پیدا کیں جن کی ادبی خدمات تاحشر زندہ تابندہ ہیں۔ برسوں کے اریز بھی اُن کے نام تاریخ سے حذف نہیں کر پائے۔ کسی بھی زبان کی بقاء اس کی ادبی تخلیقات سے مشروط ہوتی ہے۔ اگر زبان سے ادب کو الگ کیا جائے تو زبان چوں چوں کا مربہ بن کر رہ جائے لیکن فی زمانہ چوں چوں کا مربہ بنانے کا فریضہ متشاعر حضرت بخوبی انجام دے رہا ہے۔ یہ اصطلاح بھی شائد اسی صدی کی پیداوار ہے۔ سرقے بازی کی ایسی وبا پھیل گئی ہے کہ جس کا علاج ابن سینا کو زندہ کر کے بھی نہیں کیا جاسکتا اور نہ ڈاکٹر ولمار شوابی کے بس کا کام ہے جبکہ لقمان حکیم کو تو زحمت دینے کی ضرورت ہی نہیں کیونکہ طب ہرب نے ایسی دوائی ایجاد ہی نہیں کی جس سے ادب میں بلا اجازت در آنے والے جرثومے، میرا مطلب ہے متشاعر حضرات کا علاج ممکن ہوسکے۔

ڈھیٹ پن تو دیکھئے کہ کسی کا عمدہ خیال منظوم الفاظ سمیت ڈکار جاتا ہے اور معدہ ''ھل من مزید'' کا نعرہ بلند کرتا رہتا ہے۔ اس میں قاری حضرات کا بھی برابر کا قصور ہے جو ایسوں کے سینگ اُگا کر اسے ارنا بھینسا بنا دیتے ہیں۔ میرا مطلب ہے شعر غزل یا فن پارے کے بارے میں معلوم کیے بغیر سرقے باز کو واہ واہ کا ایسا ٹانک پلا دیتے ہیں کہ وہ اپنے مسل دیکھتا ہوا مزید چوری پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہ صرف بدذوق قاری ہی کا کمال ہے۔ یہ تو چھوڑیئے جب بھی سرقے بازی سے فرصت ملتی ہے تو جناب اپنے اول جلول اشعار کی بونگیاں مارنا شروع کر دیتا ہے جس میں خیال بھی سطحی اور الفاظ کا چناؤ بھی عامیانہ ہوتا ہے۔ آج کل تو خیر سے اس طبقے کو سوشل میڈیا نے خاصا مالا مال کر دیا ہے کیونکہ آئے روز کسی بیچارے شاعر یا شاعرہ کے کلام پر کسی نے ہاتھ صاف کیا ہوتا ہے۔

اگر میری بات کا یقین نہیں تو کئی متاثرین کے نام بتا سکتا ہوں جن کا کلام بس تخلص کی تبدیلی سے بیسویں متشاعرین کے نام فیس بک کی زینت بنا اصلی تخلیق کار کا منہ چڑا رہا ہوتا ہے۔ سد باب بھی تو ممکن نہیں کہ اس متاثرہ تخلیق کار کو انصاف دلایا جائے کیونکہ متشاعرین کی دیدہ دلیری اور اس کا ڈھیٹ پنا تو بعض سیاستدانوں کو بھی مات دے

جاتا ہے۔اسی حوالے سے آیئے ذرا ہم آپ کو ایک مسخرے شاعر کی شہرتِ عام کا قصہ سنائے دیتے ہیں۔

ہمارا پشتو ادب جو رحمان بابا کے صوفیانہ اور خوشحال بابا کے دلیرانہ اشعار کا امین ہے، جس سے حضرت علامہ محمد اقبال جیسی عظیم اُردو فارسی شاعری کی عظیم ہستی تک متاثر نظر آتی ہے، آج کل پھکڑ پن کی طرف رواں دواں ہے۔ نام نہاد ابلاغِ عامہ ''فرمان کسکر'' نامی ذہنی معذور شخص سے حظ اٹھانے کے لئے اس کی اونگی بونگی شاعری کو بڑھاوا دے رہا ہے۔ اس بچارے کو تو شعر موزوں کرنا بھی نہیں آتا۔ آپ خود ہی سوچیے کہ جماعت ہفتم میں پڑھنے والا ایک ذہنی طور پر معذور شخص بھلا کیسی شاعری کرے گا۔ یہ تو برا ہو اس میڈیا کا جس نے اس بچارے کو محض جگ ہنسائی کے لئے شہرتِ عام کا چسکا چڑھا دیا اور اس عقل سے پیدل بندے کو دیکھئے کہ چلا ہے بڑے بڑے ٹی وی چینلز کو انٹرویو دینے جو اس کو بلا کر پشتو ادب کو مزید ہنسی ٹھٹھول کا باعث بنا رہا ہے۔ میری تو دعا ہے کہ اللہ اس شخص کو بھی ہدایت دے اور یہ بھی کسی موزوں استاد سے استفادہ حاصل کر کے واقعی شاعر بننے کی کوشش کرے مگر فی الحال تو ایسا ہوتا نظر نہیں آتا۔

زمانے نے ہمیشہ ایسوں کو یکلخت مسترد کر دیا یا پھر یوں فراموش کر دیا جیسے گدھے کے سر سے سینگ، اگرچہ اس خر بچے نے لاکھ ڈھینچوں ڈھینچوں کا شور مچا کر پشتو ادب میں اپنی جگہ پکی کرنے کی ناکام کوشش کی ہے لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔ چینلز نے تو اسے بانس پر چڑھا رکھا ہے لیکن ادب کے سنجیدہ حلقے اسے کسی قسم کا کوئی مقام دینے کے لئے تیار نہیں۔ بھلا ایسوں کو قطعۂ زمین کون دیتا ہے جس کے پاؤں ہی زمین پر نہیں ٹکے ہوئے ہوں۔

کسی بھی زبان کی ترقی عہد بہ عہد اس کے بہترین قلمکاروں سے مشروط ہے لیکن جب بات یہاں تک پہنچ جائے کہ سچے تخلیق کار کی بے توقیری ہو اور اس کو دیوار سے لگانے کی کوشش کر کے متشاعروں کو آگے لایا جائے تو زبان میں بدیسی اور لایعنی الفاظ کا اضافہ ہونا اچنبھے کی بات نہیں، ایسے لایعنی الفاظ کہ جس سے زبان

کی اپنی اصلی شکل کہیں گم ہو کر رہ جاتی ہے۔

شاعری ایک الہامی خوبی ہے جس کو اللہ ودیعت کرتا ہے، اُسی حساب سے اس کو وسعتِ قلبی بھی عطا کرتا ہے اور ایک شاعر اسے معاشرے کی ناہمواریوں کو منظوم الفاظ کا جامہ پہنا کر اس کا اظہار کرتا ہے مگر بعض جعلساز افراد سستی شہرت کے لئے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کرنے پر اُتر آتے ہیں اور دوسروں کے خیالات چرا کر عامیانہ طریقے سے نام نہاد ابلاغ شروع کر دیتے ہیں۔ اس کے خیال میں یہ اس کی انفرادیت ہوتی ہے لیکن جب کوئی ادب کے جملہ اصول سے ہی بغاوت کر کے اپنا الگ رستہ ناپتا ہے تو دراصل وہ ادبِ لطیف کے بجائے ادبِ قبیح کو فروغ دے رہا ہوتا ہے۔ ایسے باغی بھی متشاعر کہلائے جاتے ہیں جو پھکڑ پن سے کام لے کر نام کمانے کی ناکام کوشش کرتے ہیں کیونکہ ایسے لوگ ادب کی تاریخ کا حصہ ہی نہیں بن پاتے اور اپنی موت آپ مر جاتے ہیں۔ امر کلام وہ ہے جو ایک بدذوق کو بھی دادِ تحسین دینے پر مجبور کر دے۔

ایک منظوم کلام سے متشاعر کا عکس یہی بن سکتا ہے۔

ایک عمدہ، بہتریں، اچھی غزل درکار ہے
لازماً استاد جی مجھ کو یہ کل درکار ہے

بھیج دوں گا آپ کو جتنی رقم بھی چاہیے
کاٹ ہوں الفاظ میں نشتر قلم بھی چاہیے
نادرونازک تخیل، زیروبم بھی چاہیے
طرزِ نو، جدت پسندی، پیچ وخم بھی چاہیے

بے مثال و بے نظیر و بے بدل درکار ہے
ایک عمدہ، بہتریں، اچھی غزل درکار ہے

آپ کو معلوم ہے مشہور کتنے ہو گئے
صاحبانِ علم کو منظور کتنے ہو گئے

''میری'' غزلیں دیکھ کر مسحور کتنے ہو گئے
ہاں مگر اس شاعری سے دور کتنے ہو گئے

میری الجھن کے لیے کوئی تو حل درکار ہے
ایک عمدہ، بہتریں، اچھی غزل درکار ہے

قافیہ کیا چیز ہے ہم کو پتہ کوئی نہیں
ہاں عروضی علم پر اپنی ٹکی سوئی نہیں
صرف سرقے کے علاوہ کچھ غزل گوئی نہیں
بس ڈھٹائی کے سوا عزت ہمیں چھوئی نہیں

نام رکھنے کو کلامِ برمحل درکار ہے
ایک عمدہ، بہتریں، اچھی غزل درکار ہے

یہ دعا کر لو کہیں ''ساغر'' نہ بن جائے کوئی
واقعی شاعر ہو تو بے در نہ بن جائے کوئی
در بہ در پھرتا رہے بے گھر نہ بن جائے کوئی
شاعرِ طفلِ سخن گوہر نہ بن جائے کوئی

فی زمانہ کوئی تو نعم البدل درکار ہے
ایک عمدہ، بہتریں، اچھی غزل درکار ہے

گوہر رحمٰن گہر مردانوی کا تعلق ضلع مردان کی تحصیل تخت بھائی (لوندخوڑ) سے ہے۔ سرکاری ملازم ہیں۔ فنونِ لطیفہ سے خصوصی شغف رکھتے ہیں۔ علاوہ ازیں شاعری اور مضمون نگاری بھی ان کے ابلاغ کے ذرائع ہیں۔ شاعری میں خاصے پُرگو واقع ہیں۔ مضامین میں لطافت اور طنز کا چھڑکاؤ فنفنی فنفنی ہوتا ہے۔ ''ارمغانِ ابتسام'' کے مستقل کرم فرما ہیں اور اس کے پڑھنے والوں کے لئے ہر ماہ باقاعدگی سے مرچ مصالحے کا اہتمام کرتے ہیں۔

قندِ شیریں

مزاح کے نئے رنگ اور فیس بک والے

حافظ مظفر محسن

نذیر انبالوی نے جب ”مزاحیات کا انسائیکلو پیڈیا“ تیار کیا تو سب سے پسندیدہ بات وہ جملے وہ فقرے وہ چٹکلے تھے جو مختلف رکشوں، ٹرکوں یا ایسی ہی سواریوں کے پیچھے لکھے ہوتے تھے۔ نذیر انبالوی نے یہ ”اچھا کام“ ہماری درخواست پر کیا تھا۔ مشہور ریڈیو فنکار نظام دین نے کتاب لکھی ”اکھان“ اس میں کچھ پنجابی محاورے تھے وہ باتیں وہ فقرے وہ تیکھے تیر جیسے جملے تھے جو عوام گلی محلہ چوکھٹ چوبارے ”ڈیرہ“ چوپال یا عوامی مقام پر بولتے ہیں اور داد دیتے ہیں۔ یہ اکھان، یہ محاورے گفتگو میں رنگ بھر دیتے ہیں۔

آپ کا موڈ خراب ہو، بیٹا بات نہ مانے بیوی حسب عادت بے عزتی کرے لیکن وہ شہزاد سپرا کے بقول ؂

ظالم ہووے پہاویں زمانہ
ٹھگاں نے وی ایتھوں ای کھانا

یعنی بیوی سے بے عزت ہو کے بھی تو لوٹ کے بدھو کو گھر آنا ہے۔ ڈالر آسمان کو چھو رہا ہے۔ عمران خان قوم کو کبھی نہ پورے ہونے والے عجب بے خواب دکھا رہے ہیں اسد عمر پھر سے کسی اعلیٰ منصب پر براجمان ہونے کو ہیں اپنے محبوب عامر لیاقت پھر سے چینل پر ہیں سنا ہے اُن کی ”پہلی“ (دوسری تیسری وغیرہ سے ہمیں کیا۔) بشریٰ عامر بھی اب کے کسی چینل پر رمضان کی نشریات کر رہی ہیں۔ امید ہے اگلا رمضان ان دونوں کو ایک ساتھ رمضان نشریات کرتا دیکھیں گے۔ انتظار کریں۔ پریشان نہ ہوں۔

وسیم اختر عدیمؔ کے والد محترم فوت ہوئے ہم حسب عادت قصور جا کر افسوس نہ کر پائے، بہر حال چونکہ ہمیں وسیم اختر عدیم سے محبت ہے ہم نے فون پر فیس بک پر تعزیت کر لی اور سمجھا کہ ہم سرخرو ہو گئے، حالانکہ ہم شرمندہ ہو گئے اور باتیں بدل گئیں رسم و رواج بدل گئے۔ محبوب بدل گئے محبتیں بدل گئیں راستے بدل گئے منزلیں بدل گئیں۔۔ وسیم اختر عدیمؔ رانا ابوبکر کی طرح فیس بک والوں کو ہنسانے گدگدانے میں مگن رہتا ہے۔ عادل گلزارؔ فیصل آبادی بھی اس میدان میں کسی سے پیچھے نہیں؟؟ ثقلین گوندل پولیس میں سب انسپکٹر ہیں لیکن گانے، خوبصورت خوش کر دینے والی گفتگو اور اپنی فنکاری سے لوگوں کے دل موہ لیتے ہیں۔ یعنی پولیس کی نوکری نے ثقلین گوندل کا کچھ نہیں بگاڑا۔ ہمیں ایک اچھا فنکار بھی مل گیا اور پولیس کے کرخت و تلخ انداز میں یہ خوش رنگ آفیسر دلوں کو لبھانے لگا۔

وسیم اختر عدیم کا تازہ ٹکڑا دیکھیں۔(ایسے خوبصورت ہنسا ہنسا کے لوٹ پوٹ کرنے والے ٹکڑے یہ وسیم۔۔۔فیس بک پر عوامی تفریح کے لئے لگاتا ہے)

''مسجد میں سب سے قابلِ رشک چیز وہ بابا ہوتا ہے جس کو ہر پنکھے کے بٹن کا ٹھیک ٹھیک ''ایڈریس'' معلوم ہوتا ہے۔''

وسیم نے ہمیں صبح سویرے ہنسایا اور بہت کچھ یاد دلایا۔آپ تھکے ہارے گھر آئیں تو اندھیرے کمرے میں داخل ہوں تو ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا۔آپ غصے میں سارے بٹن دباتے ہیں ابا جی سوئے ہوں تو پھر جو کچھ سننا پڑتا ہے خدا کی پناہ۔مساجد میں بہر حال ایسے بابے ہوتے ہیں جو مسجد پر بھی نظر رکھتے ہیں مولوی پر بھی اور نمازیوں پر تو اُن کی یقیناً نظر ہوتی ہی ہے۔محلے کی بزرگ عورتوں کی طرح۔(جو طلاقیں کروانے خواصورت لڑکیوں کے رشتوں کی راہ میں رکاوٹ ڈال کر خوش ہوتی ہیں خود کو فنکار سمجھتی ہیں حالانکہ ایسی عورتوں کے میاں اکثر دوسری شادی کر کے فلاح پا چکے ہوتے ہیں)

وسیم اختر عدیم کا ایک اور چٹکلہ ملاحظہ ہو۔۔

''پنجابی بلاشبہ عمدہ زبان ہے مگر پنجابی زبان میں الفاظ اُ کے ستعمال میں کچھ احتیاط بھی ضروری ہے جیسا کہ آپ کسی بھی ادھیڑ عمر خاتون کو احترام سے ''ماں جی'' کہہ سکتے ہیں مگر کسی بھی ادھیڑ عمر مرد کو ''ابا جی'' نہیں کہہ سکتے مختصر لکھیں تو پنجابی میں۔۔''ماں بہن سانجھی ہے مگر ''ابا'' (Father) اپنا اپنا ہوتا ہے؟؟''

فیس بک پر اور ''ٹک ٹاک'' پر آپ کو چھوٹے چھوٹے ویڈیو کلپس ملیں گے جو نہایت مزیدار ہوں گے لیکن ان ویڈیو کلپس میں ہیروئن بازار سے نہ ملنے پر لڑکے یا مرد۔اپنی بہن یا پھو پھو۔۔خالہ کو بھی ہیروئن بنا کر پیش کر رہے ہیں اور داد بھی وصول کر رہے ہیں۔۔کیونکہ ''شوق دا کوئی مل نئی''۔(ویسے بھی رشتوں کا تقدس اب نہیں رہا۔نہ ہمارے ہاں نہ ہی ان کے ہاں؟)

معیظ کی اماں نے آج صبح ایک لطیفہ سنایا جو سارا دن میرے سر کے گرد گھومتا رہا۔اور میں سوچتا رہا کہ ''پہلے لطیفے سکھوں کے گرد گھوما کرتے تھے اب لطیفے خیر سے ''میاں بیوی'' کے ہی گرد گھومتے ہیں۔ملاحظہ کریں۔

''بچہ سکول دیر سے پہنچا تو مس نے ڈانٹا اور غصے سے بولی ''تم سکول دیر سے کیوں آئے ہو؟''

بچہ: ''میرے امّی ابّو کی لڑائی ہو رہی تھی!''

مس: ''اِس لڑائی سے تمہارا کیا تعلق؟''

بچہ: ''مس جی میرا اِک جوتا امی کے ہاتھ میں تھا جبکہ دوسرا جوتا ابو کے ہاتھ میں۔''

ویسے میں اِس دنگے فساد کے حق میں ہوں۔میں سمجھتا ہوں کہ میاں بیوی کو ہر روز لڑ جھگڑ کے۔۔تو تو۔۔تو تو (یہاں میں نہیں ہوتی) کر کے اِک دوسرے کو گالی گلوچ کر کے۔۔جوتے ۔۔۔کے۔۔چپل کا کام استعمال کر کے۔۔رات ٹھیک اڑھائی بجے سے پہلے پہلے صلح کر لینی چاہیئے!اور صبح سویرے بیوی کو چاہیے کہ وہ ''محبت سے'' پوچھے'' آپ ناشتے میں کیا لیں گے؟''

اور مرد جاتے ہوئے پوچھے ''بیگم رات جو تمھاری سینڈل لڑائی مار کٹائی کے دوران ہمسائے کے گھر جا گری تھی،کوشش کرنا کہ وہ کسی طرح سے مل جائے،اگر نہ ملی تو شام تیار رہنا۔۔۔میں تمہیں نئی سینڈل لے کر دونگا۔''

طلاق اور علیٰحدگی سے لڑنا،جھگڑنا،جھگڑنا پھر لڑنا کہیں بہتر ہے۔یہ میرا مشورہ ہے لیکن کریں گے تو آپ وہی جو آپ کا دل چاہے یا آپ کی بیگم پسند کرے!

حافظ مظفر محسن صاحب کا تعلق لاہور سے ہے۔میں بچپن سے اِن کی کہانیاں اور نظمیں بچوں کے مختلف رسائل میں پڑھتا چلا آ رہا ہوں۔بچوں کے ادب میں اِن کا حصہ قابلِ ستائش ہے۔بہت اچھے شاعر اور کالم نگار ہیں۔ان کے کالم ایک مؤقر اخبار میں ''طنز و مزاح'' کے عنوان سے مسلسل شائع ہو رہے ہیں۔مزاح نگاری اِن کا خصوصی میدان ہے۔طنز و مزاح پر مبنی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔اِن کے اندازِ تحریر میں شگفتہ بیانی، بیساختگی اور ڈرامائی عناصر وافر پائے جاتے ہیں۔''ارمغانِ ابتسام'' کے لئے بہت عرصہ سے لکھ رہے ہیں۔

بہ طرزِ اکبر الہ آبادی

پہنے نقاب آئیں نظر چند بیبیاں
ممکن نہ تھا کہ چہروں کو ان کے کوئی پڑھے
پوچھا ''جدید دور میں یہ رنگ مذہبی؟''
بولیں'' ارے یہ ماسک الرجی کے ہیں چڑھے''

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

بہ طرزِ غالب

ہاتھ اپنے ملے گا آخر کار
دل جلے گا، جلے گا آخر کار
''موت کا ایک دن معین ہے''
عقد کب تک ٹلے گا آخر کار

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

کیا کرے کوئی

نہ کرے یوں خدا کرے کوئی
اب نہ خود پر جفا کرے کوئی
بیویاں چار کرنا آساں ہے
چار ساسوں کا کیا کرے کوئی

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

Bill، Bull

بجلی نصف ہی دن آتی ہے
بل پر کل کا کل آتا ہے
نرخ بڑھے بجلی کے جب سے
Bill نہیں آتا، Bull آتا ہے

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

بوریت کا علاج

جس کی دنیا میں کہیں تمثیل ملتی ہی نہ ہو
دوستو! لوگوں کو ایسا ہی تماشہ چاہئے
ایک دہشت گرد نے اک دوسرے سے یہ کہا
امن ہے چاروں طرف پھر اک دھماکہ چاہئے

چونچ گیاوی

جلتی پر تیل

اب سیاست ہے اداکاری کی چونچ
اک اضافہ اور ہندوستان میں
لوٹنے کو کھادی والے کم تھے کیا
آگیا جو بالی ووڈ میدان میں

چونچ گیاوی

شکر خورے اور شکر

تباہی کا زمانہ ڈھونڈتے ہیں
امیروں کا گھرانہ ڈھونڈتے ہیں
جو چندہ خور ہیں اے چونچ ہردم
وہ چندے کا بہانہ ڈھونڈتے ہیں

چونچ گیاوی

انتباہ

غلط باتوں پہ چپ رہنا مجھے اچھا نہیں لگتا
غلط سننا غلط کہنا مجھے اچھا نہیں لگتا
بجادوں اینٹ سے میں اینٹ اتنا چونچ میں ہے دم
خموشی سے ستم سہنا مجھے اچھا نہیں لگتا

چونچ گیاوی

بدگمانی

میں نے آنگن میں تو آتے ہوئے دیکھا پتھر
رب ہی جانے کہ یہ کس سمت سے آیا پتھر
پھینکنے والا کوئی اور تھا مگر اے چونچ
میں نے سمجھا کہ پڑوسی نے ہی پھینکا پتھر

چونچ گیاوی

شکاگو یا چکاگو

بن کے سورج، آئے مغرب کی طرف
دیکھ کر دنیا کو، حیراں رہ گئے!
شیخ جی آئے امریکہ میں جب
وہ "شکاگو" کو "چکاگو" کہہ گئے

تنویر پھول

رقیب گٹر میں

غرور کا ہے یہ عالم کہ پھٹنے والا ہے
دماغ عرش پہ لے جاکے اپنی بات کرے
رقیب خود کو ستارہ سمجھ رہا ہے مگر
اُسے ہو شرم تو جا کر گٹر میں ڈوب مرے

تنویر پھولؔ

ڈاکو آزاد، پبلک پریشان

لانچ میں بھر بھر کے ڈالر لے گئے
اور تہ خانوں میں پنہاں کر دیا
مجرموں سے ڈر کے مہلت دی انھیں
بھوکی پبلک کو پریشاں کر دیا

تنویر پھولؔ

چار بیویاں

پھولؔ ! وہ چاہتے ہیں چار ازواج
ایک میرا ہیں، اِک حمیرہ ہیں
خواہشِ مولوی اُدھوری ہے!
اُونٹ کے منہ میں وہ تو زیرہ ہیں

تنویر پھولؔ

استقبالِ رمضاں

بڑھاؤ قیمتیں گھی کی، شکر کی اور کھجوروں کی
مبارک ماہ روزوں کا، سنو! آنے ہی والا ہے
ملے گی اُن کو عقبیٰ میں، تمھیں یاں ہی ملے جنت
بنانے کا یہیں باغِ جناں، نسخہ نرالا ہے !

تنویر پھولؔ

نون اور پی

''نون'' سے ناداری آئی ، پیپلز''پی'' نے کیا
بیچ دو مُلّاؤں کے، اپنی ہوئی مرغی حرام
ہر مہینے پھولؔ ! سب کے منہ پہ آتی ہے ہنسی
مسکراہٹ کا ہے تحفہ ''ارمغانِ ابتسام''

تنویر پھولؔ

صاحب اور صاحبہ کا چکّر

''فردوس'' کو بنایا ''صاحب'' ہے شیخ جی نے
صاحب کا ، صاحبہ کا کیا چل رہا ہے چکّر
کیا لیڈروں کی جنسیں تبدیل ہو رہی ہیں ؟
''مجنوں'' بنا ہے ''بیوی''، ''لیلیٰ'' بنی ہے شوہر!

تنویر پھولؔ

اپنا کیا کرایا

کیوں "بلاول صاحب" کہنے پہ اتنا احتجاج!
یاد ہے؟ فریال نے "مرحوم" بھی تھا کہہ دیا
پہلے پھوپھی جان ، پھر عمران کی پھسلی زبان
بھٹو نانا نے بھی کیسا لفظ جذبے میں کہا!

تنویر پھول

دردِ اُردو

آج اُردو کے بابا غمگیں ہیں
جس کو دیکھو، چھری چبھوتا ہے
"ذمہ واری" کہ "ذمہ داری" ٹھیک؟
درد ہوتی ہے یا کہ ہوتا ہے؟

تنویر پھول

قربانیاں

شیخ صاحب کی شیخیاں سُن کر
باغ میں پھول مسکراتے ہیں
اتنی قربانیاں اُنھوں نے کیں!
سارے قصاب منہ چھپاتے ہیں

تنویر پھول

کنڈا

بنا کر ہزاروں کے بل بھیجتے ہو
قیامت سی گھر گھر مچائی ہوئی ہے
مرا گھر جو روشن ہے کنڈے کے دم سے
یہ چوری تمھیں نے سکھائی ہوئی ہے

مرزا عاصی اختر

مشکل میں

چیز ہم سے جو تم نے مانگی ہے
شادی البم کو اس کی تاب کہاں
آنکھ میرا کی حسن ریما کا
ایسا رشتہ ہے دستیاب کہاں

مرزا عاصی اختر

شادی ہال

عشاء سے فجر ہونے آئی ہے اے میزباں سن لے
کہ خود کو سانس کی ڈوری سے کیسے جوڑ رکھا ہے
کسی کو کیا بتائیں ہم نے اس دعوت کے چکر میں
گزشتہ چھ دنوں سے کھانا پینا چھوڑ رکھا ہے

مرزا عاصی اختر

عنقا

کچھ ضروری تو نہیں ہر بات کا مفہوم ہو
اور مطلب لازمی نکلے کسی تحریر کا
ہم سیاستداں ہیں، ہم کو آگہی سے کیا غرض
"مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا"

مرزا عاصی اختر

لوٹا کیا ہے

مجھ سے دورانِ سفر ایک بدیسی بولا
یہ ترے دیس میں ہر روز تماشا کیا ہے
کیوں بدلتے ہیں وفاداریاں اکثر ممبر
ہارس کہتے ہیں کسے اور یہ لوٹا کیا ہے

مرزا عاصی اختر

بولا نہیں کرتے

"جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے"
لوٹوں کا مگر طرزِ تجارت ہے نرالا
چپ چاپ بکا کرتے ہیں بولا نہیں کرتے

مرزا عاصی اختر

محلے والے

الیکشن جیت کر روپوش ہے وہ
تلاش اس کی بہت کروا رہے ہیں
کھلے ہیں چار سالوں سے گٹر سب
محلے والے غوطے کھا رہے ہیں

مرزا عاصی اختر

مسز ان وار

الیکشن جب سے جیتی ہے پڑوسن
بہت خونخوار ہوتی جا رہی ہے
مسز انوار کو کیا ہو گیا ہے
مسز "اِن وار" ہوتی جا رہی ہے

مرزا عاصی اختر

سبب

اگر میں تم سے پہلے مر گئی تو کیا کرو گے تم
کہا میں نے مری میت بھی تیرے پیچھے آئے گی
جو پوچھا اُس نے کیوں تو میں نے بتلایا یہ بیوی کو
خوشی حد سے سوا ہو جائے تو جاں لے کے جائے گی

مرزا عاصی اختر

مزید کنڈے

بل ہزاروں میں جو بجلی کا ملا ہے عاصیؔ
جوش میں بیچ دئے بیوی کے بندے ہم نے
اور جب ظلم بڑھا حد سے تو اوروں کی طرح
بحرِ ظلمات میں ڈلوائے کنڈے ہم نے

مرزا عاصیؔ اختر

سیکٹری

بیوی تمھاری گھورتی رہتی ہے کیوں مجھے
بولی بپھر کے باس سے یوں اس کی سیکٹری
بولا یہ باس اس کا سبب ہے یہی ڈئر
آنے سے پہلے آپ کے وہ ہی تھی سیکٹری

مرزا عاصیؔ اختر

نادرہ بی بی

کتنی نادر نادرہ کی پھرتیاں
اس ادارے کی کریں ہم کیا ہی بات
کارڈ بن کر آ گیا مرحوم کا
آخری تاریخ لکھ دی تاحیات

عابدؔ محمود عابد

داد

داد لینا چاہتے ہو تم اگر
شاعری اپنی سناؤ بس وہاں
سننے والے ہوں نہ ہوں یارو مگر
مکھیاں مچھر زیادہ ہوں جہاں

عابدؔ محمود عابد

تعصب

جب اچانک بند بجلی لوٹ آئی دوستو!
افراتفری مچ گئی اور کچھ رُکا کچھ چل گیا
اک فریزر، ٹی وی، اے سی، اور موبائل تین چار
''آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا''

عابدؔ محمود عابد

پیٹو کا شکوہ

کہہ رہا تھا ایک پیٹو طیش سے
بھوک جیسی کوئی مشکل ہی نہیں
کیوں نہیں دیتے مجھے کھانا بہت
کیا تمھارے پیٹ میں دل ہی نہیں

عابدؔ محمود عابد

جریدہ

مدیروں نے مل کر نکالا جریدہ
رکھا نام جس کا ادب کا سفینہ
یہی ٹائٹل پر لکھا سب نے پایا
مسلسل اشاعت کا پہلا مہینہ

عابد محمود عابد

انجام

پھنس گیا میں کر کے دو شادیاں
میں پہنچنے لگا ہوں انجام کو
پیٹتی ہیں بغیر ناغے کے
صبح کو ایک، دوسری شام کو

عابد محمود عابد

پھول اور بھنورے

ہر اک عمر کے بوڑھے، جوان اور نیک و بد
بد نظری کے کتنے ہی دلدادہ تھے
جتنے پھول تھے اس کی کالی کرتی پر
گھورنے والے بھنورے اس سے زیادہ تھے

ڈاکٹر عزیز فیصل

یادگار ناشتہ

فراڈ مجھ سے تواضع بھرا کیا اس نے
خراب کر دیا سارا ہی ذائقہ اس نے
میں میزبان کو دل سے دعائیں کیسے دوں
کہ کھٹملوں سے کرایا تھا ناشتہ اس نے

ڈاکٹر عزیز فیصل

سوٹ

لوگ کہتے ہیں ترے پیار کو گولی ماروں
دل مگر پھر بھی اسے شوٹ نہیں کرتا ہے
اس لیے عید پہ دوں گا نہ تمھیں گفٹ میں سوٹ
اب ترا پیار مجھے سوٹ نہیں کرتا ہے

ڈاکٹر عزیز فیصل

داد

ایک گلنار داد چاہتی ہے
مرحلہ وار داد چاہتی ہے
خشک تر شعر پر بھی وہ مہ رخ
موسلا دھار داد چاہتی ہے

ڈاکٹر عزیز فیصل

کرن خان

قسطوں قسط

تیسری قسط

میں اور میرا سرجری وارڈ

ہوش سے بے ہوشی کی دنیا میں قدم رکھے جانے کتنی دیر ہوئی تھی کہ میں نے پھر سے آنکھیں کھول دیں لیکن عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔ ہر طرف دھند چھائی ہوئی تھی۔ میرا وجود بہت ہلکا ہو گیا تھا۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میں کس جگہ پر ہوں کیونکہ مجھے سارا کمرہ نظر آ رہا تھا۔۔۔ساری مشینیں۔۔۔ڈاکٹر بھی نظر آ رہے تھے لیکن وہ کسی کا آپریشن کر رہے تھے مگر کس کا؟؟ یہ یاد نہیں آ رہا تھا۔ اچانک سوچ میں ایک جھما کا ہوا آپریشن تو میرا ہو رہا تھا۔ یہ سوچ آتے ہی سنسنی سی محسوس ہوئی۔۔۔ میں کہاں ہوں۔۔۔ کیا یہ میرا لاشعور ہے یا خواب؟

الجھن بڑھتی جا رہی تھی کہ ایک دم سین بدلا اب مجھے ایک سرنگ نظر آ رہی تھی جس میں تیزی سے منظر بھاگ رہا تھا۔۔۔ میں کیسے اِس سرنگ میں سفر کر رہی تھی یہ سمجھنے سے قاصر تھی۔۔۔ روشنی والا سرا نزدیک آتا جا رہا تھا۔۔۔ آوازیں آنے لگیں لیکن عجیب سی کیونکہ کسی آواز کی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ الجھن تھی کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا لیکن خوف نہیں تھا۔۔۔ کوئی تکلیف بھی نہیں تھی اور میں میکانکی انداز میں روشنی کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس سے پہلے کے میں اس روشنی میں داخل ہو جاتی۔ ایک زور دار جھٹکا لگا۔

اور اسی جھٹکے کے ساتھ میں اس ہوش، حواس اور درد کی دنیا میں واپس لوٹا دی گئی۔ یہ جھٹکا اِتنا شدید تھا کہ میں تڑپ کر اٹھی۔۔۔ اور اٹھنے کی کوشش میں ہی پیٹ میں ناقابل بیان قسم کا درد ساتھ میں ہوا۔ اتنا شدید درد کہ میں کراہ کر واپس بیڈ پر گر گئی۔ آنکھیں میچ کر پھر سے کھولیں سوچا ''میں کہاں ہوں اتنی تکلیف کیوں ہو رہی ہے؟''

اردگرد منظر واضح ہونے لگا۔۔۔ بازوؤں کو ایک طرف سے امی نے دبوچا تھا۔ دوسری طرف سے ابو نے۔ ڈاکٹر کی طرف سے اُن کو سخت ہدایت تھی کہ ہلنے نہیں دینا۔۔۔ میری آنکھیں پھر سے بند ہونے لگیں۔ تکلیف کے شدید احساس سے آنکھ پھر کھل گئی۔ ابو

امی سے بات کرنا چاہتی تھی۔۔۔دھندلائی ہوئی آنکھوں سے دیکھا،امی رو رہی تھیں۔میں نے دوسری طرف ابو کو دیکھنا چاہا۔۔۔بہت سے اپنوں کے چہرے نظر آئے اور تقریباً سبھی آبدیدہ تھے۔دوبارہ بے ہوش ہونے سے پہلے آخری سوچ یہی آئی ''اب تو بچ گئی ہوں یہ کس خوشی میں رو رہے ہیں؟ان کو تو خوش ہونا چاہیے تھا کہ میں بچ گئی۔''

یہ بے ہوشی لمبی ثابت ہوئی کیونکہ نیم بے ہوشی کا عالم طاری رہا اس لیے کچھ یاد نہ رہا۔مجھے تین دن بعد مکمل طور پر ہوش آیا اور تب پتہ چلا کہ یہ لوگ کیوں رو رہے تھے۔مجھے دیکھ کر۔۔۔میرا تین سے چار گھنٹے طویل آپریشن ہوا تھا اور اس دوران ظاہر ہے ان لوگوں کی جان پر بنی رہی۔سر سے لے کر پاؤں تک مختلف ڈریس اور نالیاں لگی ہوئی تھیں جو ماں باپ کے لیے انتہائی تکلیف کا سبب بن رہی تھیں، بہرحال موت سے زندگی تک کا تکلیف دہ سفر کرنے کے بعد میں تین دن بعد مکمل ہوش میں تھی اور ایک تکلیف دہ پریڈ کا آغاز ہو چکا۔

ناک میں لگائی گئی نالی حلق سے گزرتے ہوئے معدے تک جا رہی تھی اور سخت تکلیف کا باعث تھی۔میں نے ہاتھ کے اشارے سے ابو کو بلایا اور بمشکل کہا کہ اس نالی کو نکلوائیں۔

ابو نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا ''ڈاکٹر آجائیں پھر نکلواتے ہیں۔''

ادھر ادھر نظریں دوڑائیں، ہر طرف میری طرح کے ہی مریض پڑے تھے اور یہ سب کچھ ماحول بدمزہ کرنے کو کافی تھا۔۔۔مجھے ایسے بورنگ ماحول سخت ناپسند۔لہٰذا قریب بیٹھی بہن کو اشارے سے بلایا۔بہن میری طرف جھکی۔

میں نے آہستہ سے کہا ''اِن کا کوئی مر گیا ہے کیا؟جب ہم مریض بچ گئے ہیں تب ماتمی شکلیں کیوں بنائی ہوئی ہیں؟''

بہن نے حیرانگی سے مجھے دیکھا۔اس کے چہرے پر حیرانی کے ساتھ ساتھ مسکراہٹ اُبھری۔اس کو غالباً اُمید نہیں تھی کہ میں اتنی جلدی اپنی جون میں لوٹ آؤں گی۔۔۔ہنس کر امی ابو کو بتانے لگی۔یہ لوگ بھی پھیکی سی ہنسی ہنسنے لگے۔

بستر پر پڑے بندے کے لیے وقت رُک جاتا ہے۔یہ مسلسل دس دن بستر پر پڑے رہنے کے بعد پتہ چلا۔ایک ایک منٹ پوچھ کر گزرتا ہے۔۔۔طویل بے ہوشی کے بعد جاگی تھی لہٰذا تین چار گھنٹے ہوش میں رہی۔

اِن تین چار گھنٹوں میں اتنا اندازہ تو ہو گیا کہ میں نے رج کے بور ہونا ہے۔۔۔نقاہت کی وجہ سے دوبارہ سو گئی۔۔۔اب جب آنکھ کھلی رات ہو رہی تھی۔۔۔میرے بیڈ کے چاروں طرف ڈاکٹرز کا ایک پورا گروپ موجود تھا۔۔۔یہ شاید راؤنڈ کا وقت تھا۔میرے جاگنے کے بعد ایک ڈاکٹر مسکرائے۔میں نے پہچان لیا یہ وہی تھے، جسے میں نے میگزین دیا تھا۔میں نے بھی ہلکی سی مسکراہٹ میں ان کو جواب دیا۔اُنہوں نے حال دریافت کیا۔میں نے اشارہ کیا کہ ناک والی نالی نکال لیں،تکلیف ہو رہی ہے۔

بولے'' آپ بہت بہادر ہیں برداشت کر لیں۔۔۔ایک دو دن تک نکال لیں گے۔''

میں مایوسی سے چپ ہو گئی۔انہوں نے میرے ساتھ وہ میگزین رکھا جس میں میری ایک کہانی اُدھوری تھی اور شفقت سے بولے''اپنی کہانی مکمل کر لینا۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔یہ لوگ اب اگلے مریض کے پاس چلے گئے۔بہن نے مجھ سے پوچھا''کون سی کہانی ہے آپی؟میں سنا دیتی ہوں آپ کو!''

میں نے مسکرا کر اس کو دیکھا''کوئی نہیں۔۔۔یہ تو میں نے اُن کو وارننگ دی تھی کہ میں نے اٹھ کر کہانی پڑھنی ہے اس لیے آپریشن کامیاب ہونا چاہیے۔''

بہن ہنس دی''اچھا،آپ کے خیال میں کہانی پڑھوانے کے لیے اُنہوں نے کامیاب آپریشن کیا؟''

''پتہ نہیں لیکن، اب تو ہو گیا کامیاب۔'' میں نے جواب دے کر آنکھیں موند لیں۔

اِتنے میں ایک نرس آئیں،اُن کے ہاتھ میں انجکشن تھا جو مجھے لگایا۔دس منٹ کے اندر اندر میں نیند کی وادیوں میں کھو گئی۔

صبح جاگی تو پتہ چلا کہ یہ سکون اور نیند دلانے والا انجکشن تھا اور

جیسے ہی یہ پتہ چلا، مجھے مزید سکون مل گیا کہ جب بھی زیادہ بور ہوں گی، یہ لگوا لیا کروں گی۔۔۔جی چھوٹا۔

اور میں نے کیا بھی ایسے۔ اِتنے انجکشن لگوائے کہ آخری دن نرس نے ہاتھ جوڑ لیے کہ بہن نشئی بن جاؤ گی۔

پانچویں دن عیادت کے لیے آنے والوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ مختلف اقسام کے رشتے دار دوست احباب سارا دن آتے رہتے۔۔۔کچھ کے آنے سے خوشی ہوتی اور کچھ کے آنے پر بیزاری۔۔۔اور بیزاری والوں کے وقت میں نرس کو بلوا کر انجکشن لگوا لیتی نیند والا۔ عیادت والا بیٹھا رہتا مجھے نیند آجاتی۔۔۔پھل اور پھول اِتنے جمع ہو گئے کہ میں نے بہن کو مشورہ دیا ''رات کو وارڈز میں پھیری لگا کر بیچ لینا، چار پیسے بیٹھے بیٹھے کما لو گی۔''

بہن نے ناراضگی سے دیکھا۔ میں نے بات کو تھوڑا چینج کیا ''اچھا کچھ کھا بھی لینا، سارے نہ بیچنا۔''

اس کو ہنسی آگئی لیکن مجھے جب ہنسی آئی تو پیٹ شدید دُکھنے لگا۔ پتہ چلا کہ یہ فعلِ آدمیت بھی ممنوع ہے۔ مزید غصہ آیا ''لو ایک تو یہ مصیبت، اُوپر سے ہنس بھی نہیں سکتی۔''

ڈاکٹر آئے۔ میں نے ریکویسٹ کی کہ ناک والی نالی نکال دیں۔ بندہ مہربان تھا، نکالنے کو راضی ہو گیا اور جب اس نے نکالنا شروع کی تب پتہ چلا کہ نالی گلے میں کھڑی ہوئی تو کوئی تکلیف ہی نہیں دے رہی تھی کیونکہ اصل مصیبت تو اب ہوئی۔ ایک انتہائی تکلیف دہ پراسس سے گزرنے کے بعد کہیں جا کر نالی نکالی گئی اور میری جان میں جان آئی۔

بہن دھیان بٹانے کو خاندان کی اَپ ڈیٹس دینے لگی۔ اچانک وارڈ میں ''ہائے، وائے'' کا شور بلند ہوا۔ ہم نے بوکھلا کر دیکھا۔۔۔کسی مریضہ کی والدہ تھی شاید، دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی کہ میری بچی مر گئی۔

میں نے بہن سے کہا ''میرا سر اوپر کرو مجھے دیکھنا ہے۔''

اُس نے میرا سر سہارا دے کر اوپر اٹھایا۔ کیا دیکھتی ہوں کہ یہ وہی تھی، جگر کے آپریشن والی۔ مجھے دُکھ ہوا کہ آپریشن تو معمولی تھا، بیچاری کے دن ختم تھے شاید۔ ڈاکٹر تیزی سے اندر داخل

ہوئے۔ آ کے مریضہ کو چیک کیا۔ ناگواری سے اُس کی ماں کو دیکھا اور کہا ''آپ کی بچی زندہ ہے۔۔۔!''

ماں نے حیرت سے دیکھا ''اچھا۔۔۔ پھر ہل کیوں نہیں رہی؟''

ڈاکٹر نے مریضہ کو مخاطب کیا ''بی بی بات کرو اپنی ماں سے۔''

لڑکی نے آنکھیں کھولیں، ماں کو دیکھا اور ہولے سے بولی ''میں ٹھیک ہوں امی۔۔۔''

اُدھر اس کی ماں کی جان میں جان آئی اور مجھے جی بھر کے غصہ

کسی شخص نے سرسیّد کی توہین کی غرض سے اُنہیں پھٹا پرانا جوتا بھیجا۔ سرسیّد نے اُسے جواب دیا کہ جوتے کی مرمت پر دو آنے خرچ ہوئے اور چھ آنے میں بک گیا، لہٰذا چار آنے کی رسید حاضر ہے۔

''الو کی پٹھی، اتنی ٹوٹکی کی ضرورت کیا تھی؟''

وہ نہیں جانتی تھی کہ اگلے چند دنوں میں اُس کی طبیعت صاف کرنے والی تھی۔

سرجری وارڈ کے اس بیڈ پر پڑے پڑے ساتواں دن شروع ہو چکا تھا جو کہ مجھے ساتواں سال محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے ہی ڈاکٹر راؤنڈ کے لیے آئے، میں نے دِلی خواہش کو زبان دی، بیزاری سے پوچھا ''مجھے ڈسچارج کب کیا جائے گا؟''

ڈاکٹر صاحب اس سوال پر یوں مسکرائے جیسے اسی سوال کی توقع تھی، نرمی سے مخاطب ہوئے ''جب آپ اپنے پیروں پر کھڑی ہو کر چل کر دکھائیں گی، اُسی وقت آپ کو گھر جانے کی اجازت ہو گی۔''

مجھے اس ڈاکٹر کے جانے کا انتظار تھا کہ یہ جائے اور میں وارڈ میں چلنے کی کوشش کروں۔ اُن سات دنوں میں مجھے کھانے پینے کے نام پر صرف دو گھونٹ چائے یا تین گھونٹ جوس پر رکھا گیا تھا، لہٰذا جسمانی طاقت و توانائی کس خطرناک حد تک ختم ہو چکی تھی، اس بات کا اندازہ اُس شام کو چلنے کی کوشش میں ہوا۔

جیسے ہی وارڈ میں رش کم ہوا، بہن سے کہا ''مجھے ڈاکٹر نے چلنے کو کہا ہے۔ سہارہ دو کھڑا کرو میں نے چلنا ہے۔''

بہن نے حکم کی تعمیل کی اور مجھے احتیاط سے بیڈ سے اتارا اور کندھے سے تھام لیا۔ جیسے ہی میں اپنے پیروں پر کھڑی ہوئی، آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور سر ایسے چکرایا کہ واپس بیڈ پر بیٹھ گئی۔ بہن حالت دیکھ کر ڈر گئی اور مجھے واپس سلانا چاہا۔ میں نے انکار میں سر ہلایا ''نہیں مجھے اس وارڈ کے دروازے تک جانا ہے، ہر صورت!''

اب دوبارہ ہمت کر کے اٹھی۔ بہن نے بھی پھر سے کندھے کو تھام لیا۔ میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھی۔۔۔ پیٹ شدید دُکھنے لگا اور قدم میرے جسم کا وزن اٹھانے سے صاف انکاری ہو گیا۔ دل کی دھڑکن اتنی تیز ہو گئی گویا سخت مشقت کر رہی ہوں۔ انتہائی مشکل کے بعد دروازے تک تو پہنچ گئی۔ اب دیوار کے ساتھ ٹیک لگائی، سانس بحال کیا۔ اپنے بیڈ کی طرف پریشانی سے دیکھا، وہاں تک واپس جانا اب پل صراط کے سفر جتنا مشکل لگ رہا تھا۔

رنگت اتنی سی مشقت میں ہی زرد ہو چکی تھی۔ بہن نے حالت کے پیش نظر وہیل چیئر لانے کا کہا، میں نے منع کر دیا اور پھر سے چلنا شروع کیا۔ انتہائی وقت سے گزرنے کے بعد اپنے بیڈ پر آ گئی۔ بہن نے لٹا دیا۔ کتنی ہی دیر تک طبیعت بحال نہ ہو پائی۔ پریشانی سے سوچنے لگی ''گھر کیسے جاؤں گی اب؟''

پیٹ میں شدید درد محسوس ہونے لگا، لہٰذا نرس کو بلوا کر انجکشن لگوایا۔ نیند کی وادیوں میں جانے سے پہلے سوچ رہی تھی کہ انسان تو نہایت بے بس اور کمزور مخلوق نکلی۔

آٹھواں روز شروع ہوا لوگ ناشتے وغیرہ کا سامان لے آئے اور دو تین دن سے میرے ساتھ یہ ظلم ہوتا کہ جیسے ہی وارڈ میں ٹفن وغیرہ کھلتے، میری جان پر بن جاتی۔ اتنی اشتہاء انگیز خوشبوئیں اٹھتیں کہ میرا دل چاہتا، ان لوگوں سے چھین کر کھا جاؤں۔ اکثر خوشبو سے اندازہ لگانے کی کوشش کرتی کہ کیا پکا ہوا ہے اور جب مجھے کوئی آفر نہ کرتا تو سخت غصہ آتا، دل چاہتا ان سے کہوں ''بے غیرتو باہر جا کر کھا مرآؤ۔''

اس بات پر بھی غصہ آتا کہ آخر یہ لوگ اتنی اتنی دیر کھانے میں کیوں لگا دیتے ہیں۔ ان کو احساس کیوں نہیں ہوتا کہ مریض کو کھانے کی خوشبو ذلیل کر رہی ہے۔ میرے ساتھ والے بیڈ پر تو اس دن حد ہی ہو گئی۔ کوئی بریانی کا ٹفن بھر کر لے آیا، ساتھ میں کوک نکلس۔ لڑکیوں نے اشتیاق سے ٹفن کھولا اور مسحور کن خوشبو بوتل کے جن کی طرح برآمد ہو گئی۔

میرے حواسوں پر طاری ہو گئی اور میں جی بھر کر بدمزہ ہوئی کہ الو کے پٹھے، یہاں سب مر رہے ہیں مریض مر رہے ہیں اور

ان کو دعوتوں کی پڑی ہے۔

یہ لڑکیاں جن، چھک کر کھا رہی تھیں اور میرے اشتعال میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور ضبط کرنے کی کوشش میں چہرے پر تکلیف کے آثار بہن نے دیکھے تو پریشانی سے پوچھا "تکلیف ہو رہی ہے؟ نرس کو لے آؤں، اگر انجکشن لگوانا ہے؟"

میں نے مایوسی سے سر ہلایا "ہاں لے آؤ نرس سے کہنا انجکشن چینج کر دے بس۔"

بہن نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے مجھے دیکھا "چینج۔۔۔ کیا مطلب؟"

میں نے ایک سخت سی نظر بریانی والوں پر ڈالی اور بہن سے مخاطب ہوئی "نرس سے کہو اس بار زہر کا انجکشن لگا دے۔"

بہن ہڑبڑا کر میری طرف دیکھنے لگی "اللہ نا کریں آپی کیسی باتیں کرتی ہیں آپ۔"

اب اس کو کیسے بتاتی کہ شدید بھوک میں بریانی کو سامنے دیکھ کر بندہ کھا نہ سکے تو کیسا محسوس کرتا ہے۔ اس بریانی والی فیملی پر اتنا غصہ چڑھا تھا کہ سوچ رہی تھی کہ کاش اس سارے خاندان کو تو آج پولیس کسی شک کی آڑ میں پکڑ کر لے جائے اور ان کی چمڑی ادھیڑ کر رکھ دے۔

ایسی وحشی سزائیں سوچ سوچ کر بہت دیر کڑھتی رہی۔ بہن کو البتہ ان لوگوں نے پلیٹ بھر کر دی جو اس نے شکریہ کے ساتھ وصول کر لی۔ اس کو اشارہ کیا کہ باہر جا کر کھاؤ مر و اور ختم ہو جائے تو اندر آ جانا۔

میری بہن تھی، آخر میرا درد سمجھ گئی اور پلیٹ اٹھا کر باہر چلی گئی۔ میں نے آنکھیں موند لیں سوچنے لگی کہ آج ڈاکٹر آئے تو آج پوچھتی ہوں کہ جب کچھ کھانے نہیں دینا تو زندہ کیوں رکھا ہے ظالمو؟"

ایک دردناک زنانہ چیخ ابھری ساتھ ہی میں نے بوکھلا کر آنکھیں کھول دیں۔ بچے کے آپریشن والی کو ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق چلانے پھرانے کو کہا گیا تھا، لہٰذا بیڈ سے اٹھانے کی کوشش میں ان کی آہ و بکا شروع ہو چکی تھی۔ ابھی بریانی کا غم ہی ہلکا نہ ہوا تھا اوپر سے اس کا تماشہ۔

غصے میں مزید اضافہ ہوا۔ کچھ ڈاکٹر میرے بیڈ پر آئے طبیعت پوچھی۔ میں نے جواب میں بیزاری کو چھپاتے ہوئے ڈاکٹر سے دریافت کیا "ایک احسان کر دیں، اس مریضہ کو اس کا "پتہ" واپس لگا دیں۔"

ڈاکٹر نے کچھ نہ سمجھنے کے انداز میں مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

میں نے اب چڑ کر کہا "جب سے اس کا آپریشن ہوا ہے، سخت صدمے میں ہے سارا دن بے جان لاشوں کی طرح پڑی رہتی ہے۔۔۔ یا تو اس کو زندگی کا احساس دلاؤ یا اس کا پتہ واپس کر دو۔۔۔ حد ہے ایک پتے کے لیے اتنا صدمہ!"

ڈاکٹر کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی جواب قہقہے میں تبدیل ہو گئی۔ بمشکل ہنسی روک کر بولے "ہمارے پاس تو پتہ نہیں ہے۔ پتے کے بغیر رہنا تو پڑے گا ان کو۔"

میں نے ایک نظر اس لڑکی کی صدماتی شکل پر ڈال کر ڈاکٹر کو جواب دیا "میرا نکال لو، اس کو لگا دو۔"

ڈاکٹر صاحب میری بات پر محظوظ ہوتے ہوئے مجھے یہ خوش خبری دیتے گئے کہ دو دن تک آپ کو ڈسچارج کر دیا جائے گا۔

یہ سنتے ہی مجھ پر شادیٔ مرگ کی کیفیت طاری ہو گئی۔

(جاری ہے)

کرن خان کا تعلق بہاولپور سے ہے۔ فی الحال حصولِ تعلیم میں مگن ہیں۔ سیاسیات ان کا مضمون ہے۔ کہانیاں لکھنے لکھانے کا بہت شوق ہے جو عموماً فکاہی رنگ لئے ہوئے ہیں۔ پیشہ ور ادیبہ بننے کی لگن ہے۔ ان کی کہانیاں عموماً طویل ہوتی ہیں لیکن ایسی جامعیت سمیٹے ہوتی ہیں کہ طوالت کے باوجود پڑھنے والا ایک ہی نشست میں پوری کہانی پڑھے بغیر نہیں رہ سکتا۔ طرزِ تحریر خاصا شستہ و شگفتہ ہے۔ نہایت بے تکلفی سے ہر بات کہہ جاتی ہیں۔ "ارمغانِ ابتسام" میں یہ ان کی اوّلین کاوش ہے جو قسط وار شائع کی جا رہی ہے۔

جستہ خستہ

بس یونہی

اقبال حسن آزاد

پروفیسر پی پی سنہا میرے کالج میں فزکس کے استاد ہیں۔ شاعرانہ مزاج رکھتے ہیں اور اچھی اردو بولتے ہیں۔ ان کی رہائش بھاگلپور میں ہے۔ وہ وہاں سے ٹرین پکڑ کر جمالپور پہنچتے ہیں اور ساڑھے دس یا پونے گیارہ بجے تک کالج پہنچ جاتے ہیں۔ میں گیارہ بجے ٹیچنگ اور نان ٹیچنگ اسٹاف کا حاضری رجسٹر اپنے پاس منگوالیا کرتا ہوں۔

ایک روز میں نے دیکھا کہ رجسٹر میں ان کے دستخط نہیں ہیں۔ انہوں نے کوئی چھٹی کی درخواست بھی نہیں دے رکھی تھی۔ میں نے یہ سوچ کر کچھ دیر اور انتظار کیا کہ شاید ان کی گاڑی لیٹ ہوگئی ہو۔ خیر اگھڑی کی سوئیاں آگے بڑھتی رہیں۔ گیارہ سے ساڑھے گیارہ، پونے بارہ یہاں تک کہ ساڑھے بارہ بج گئے مگر ان کے آنے کی کوئی خبر نہیں ملی۔ تب میں نے انہیں فون لگانے کی کوشش کی لیکن رابطہ قائم نہ ہوسکا۔ آخر جب ایک بج گیا اور میں ان کے نام کے آگے لال قلم لگانے ہی والا تھا کہ وہ شاداں و فرحاں ہنستے مسکراتے میرے چیمبر میں داخل ہوئے۔ ان کا سرخ و سپید چہرہ کسی اندرونی مسرت سے گلنار ہو رہا تھا۔ آتے ہی معذرت کرنے لگے۔ میں نے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا تو انہوں نے کرسی سنبھال لی اور اس سے پہلے کہ میں ان سے دیر سے آنے کا سبب پوچھتا وہ خود ہی کہنے لگے کہ سر! کیا بتاویں، آج ایک عجیب اتفاق ہوا۔ میری گاڑی تو صحیح وقت پر کھل گئی تھی لیکن ہوا یہ کہ اگلے اسٹیشن پر ایک لڑکی میری بغل والی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئی۔ گاڑی جب وہاں سے روانہ ہوئی اور کھڑکی سے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اندر آنے لگے تو میں نے دیکھا کہ اس کی پلکیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ پھر اس نے میرے کندھے پر اپنا سر رکھ دیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ گہری نیند میں گم ہوگئی۔ یہاں تک کہ جمالپور آ گیا۔ میں اس کے جگنے کا انتظار کرتا رہا لیکن وہ خیند کی ماتی بیدار ہی نہ ہوئی۔ اب میرے دل نے یہ گوارا نہیں کیا کہ اس معصوم کی نیند خراب کر دوں لہٰذا میں بیٹھا رہ گیا۔ ٹرین یہاں سے کھل گئی۔ پھر اور کئی اسٹیشن آئے۔۔۔ دسرتھ پور، ابھے پور، ادرین لیکن وہ پھر بھی نہ اُٹھی۔ یہاں تک کہ لکھی سرائے آ گیا اور تب وہ چونک کر اُٹھی اور اپنی حیران حیران سی نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔ پھر وہ اچانک سیٹ سے اُٹھی اور دروازے کی جانب بڑھ گئی۔ اسے شاید یہیں اُترنا تھا۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے نیچے اُتر آیا۔ پھر وہ تو اپنے رستے ہو لی اور میں واپسی کی ٹرین کا انتظار کرنے لگا۔ خیر جلد ہی پٹنہ سے آنے والی ایک گاڑی مل گئی اور اس طرح میں کالج پہنچ گیا۔

ان کی بات سن کر میں یہ سمجھ گیا کہ انہوں نے ضرور غالب کا یہ مصرع پڑھ رکھا ہوگا کہ

تا نہ پڑے خلل کہیں آپ کے خواب ناز میں

جمہوریت

محمد خلیل الرحمٰن

آنکھ کھلتے ہی اخبار کا مرکزی صفحہ دیکھ کر حیرت سے اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ نہ سنسر شدہ خالی کالم تھے، نہ ٹکٹکی پر مجرموں کو کوڑے لگ رہے تھے نہ سمری ملٹری کورٹس کی خبریں تھیں۔

جلسے، جلوس، دھرنے۔ اخبار بھرا پڑا تھا۔

''ابا! آپ دس سال سوئے رہے۔ سب کچھ بدل گیا، جمہوریت آ گئی۔''

اُسی شام مباحثے میں شرکت کے لیے پہنچا تو ایک کاغذ اسے تھما دیا گیا۔ ''ضابطۂ اخلاق''

''میں نہیں مانتا، میں نہیں جانتا''

منتظم کے منہ سے جھاگ نکلنے لگا۔ ''تمہاری جرات کیسے ہوئی اس مقدس دستاویز کو جھٹلانے کی؟''

منزل

محمد خلیل الرحمٰن

شرفو کو لاہور دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ جب بھی وہ لاہور کے متعلق سنتا کہ ''جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ پیدا ہی نہیں ہوا!''

اُس کا شوق ایک انگڑائی لے کر جاگ اٹھتا۔

بالآخر ایک دن وہ اپنے سفر پر نکل کھڑا ہوا۔

''بھائی! لاہور کس طرف ہے؟'' اس نے ایک راہگیر سے پوچھا۔

''اِس پگڈنڈی پر ناک کی سیدھ میں چلتے جاؤ۔ جب بڑی سڑک ملے داہنے مڑ جانا، بس لاہور پہنچ جاؤ گے۔''

بڑی سڑک پر چلتے چلتے وہ ایک پتھر کے قریب پہنچا جس پر ''لاہور'' لکھا تھا۔

اُسے لاہور دیکھ کر بڑی مایوسی ہوئی۔

میری برسانی

راشد حمزہ

جب میں یہ بارانی پہنتا ہوں تو میرا حلیہ بہت عجیب اور بڑا مضحکہ خیز سا بن جاتا ہے لیکن بارشوں اور برف باریوں کے ان مہینوں میں اس کے پہننے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ میرے لئے اس کے بغیر گھر سے نکلنا ناممکن رہتا ہے اس موسم میں، میں یا تو گھر میں محصور رہتا ہوں یا بارانی پہن کر بغیر کسی مقصد کے گھومتا پھرتا ہوں، مجھے بہت اچھا محسوس ہوتا ہے جب میری بارانی پر برف کے پھول جمع ہوجاتے ہیں اور میں اُسے جھاڑنے لگتا ہوں۔

جب میں اسے پہن کر چلتا ہوں تو پچھلی طرف سے دیکھنے پر یوں معلوم ہوتا ہے جیسے بغیر سینگ اور کان کا گدھا ہے جو پچھلی ٹانگوں پر کھڑے کھڑے چل رہا ہے، بات بات پر انسانوں کی طرح ہنس رہا ہے اور تجسس آمیز نگاہوں سے ہر منظر پر نظریں ڈھیر کردیتا ہے جیسے یہ سبز گھاس کی حسین وجمیل چراگاہیں ہوں، سامنے کی طرف سے بھی یہ میرے اس روپ کو بگاڑ دیتا ہے جو لوگوں کو ازبر ہوچکا ہے۔ لڑکپن کے اُن دنوں میں جب شباب کے دروازے کھلتے ہیں میں اسے پہننے سے اس خیال سے اجتناب کرتا تھا کہ کہیں شباب کی وادیوں میں گھومنے والی نئی اور معصوم لڑکیاں مجھے تحیر خیز اور نشاط انگیز نظروں سے دیکھنا چھوڑ دیں گے۔

اب میں اُسے بلا خوف وخطر پہنتا ہوں مجھے اس طرح کا کوئی خدشہ لاحق نہیں رہتا کہ اسے پہنتے ہوئے دیکھ کر خواتین میرے بارے میں کیا سوچیں گی، بچے مجھے دیکھ کر ہنستے ہیں اور میرا مذاق اُڑاتے ہیں میں خوش ہوجاتا ہوں کہ اب میں کسی کے لئے نہ سہی بچوں کے لئے کوئی انوکھی دلچسپ اور قابل توجہ شئے ہوں، اس دوران مجھے اُن بچوں کی خاص فکر رہتی ہے جنہیں مائیں بارانی پہنے ہوئے میرے رنگ وروپ سے ڈراتے ہیں، میری خواہش ہوتی ہے کہ میں کسی طرح ان ماؤں کو یقین دلاؤں کہ وہ مجھے خوف کے کسی حوالے سے یاد نہ کرے مجھے بچے بہت پسند ہوتے ہیں اور ان کو ڈرانا سخت ناپسند رہتا ہے، میرا حلیہ مضحکہ خیز ہوسکتا ہے لیکن ڈراؤنا اور بھیانک ہرگز نہیں۔

سائیکل

راشد حمزہ

ایک مہینے پہلے جب میں سائیکل سیکھنے کا آغاز کررہا تھا تو میں بے حد پرجوش بھی تھا اور کہیں کہیں مایوس بھی تھا۔ پرجوش اس لئے تھا کہ اپنی دیرینہ خواہش پوری کررہا تھا، مایوسی کی وجہ میرا خوف تھا۔ اگرچہ میں نے سائیکل سیکھنے کا پختہ

عزم کئے ہوئے تھا لیکن میرے ارادے میں پھر بھی کہیں جرأت کی کمزوری اور میرا خود پر یقین میں شک کا شائبہ شامل تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں سائکل سیکھ تو گیا لیکن اس معمولی سے کام کے لئے مجھے سخت محنت اور جتن کرنے پڑے یہاں تک کہ خدا کو بھی دعاؤں کے ذریعے اپنے اس منصوبے میں شریک کرنا پڑا۔

میری یہ سوچ بھی سائکل سیکھنے کی راہ میں رکاوٹ بن کر کھڑی رہی کہ جب لوگ مجھے گاؤں کی مضافاتی سڑک پر سائکل

پر بیٹھے دوڑتے چیختے چلاتے دیکھیں گے تو کیا کہیں گے۔ وہ میرے سماجی مراتب کا خیال رکھتے ہوئے شاید سرِ عام گالیاں نہیں بکیں گے لیکن پیٹھ پیچھے اپنی انتہائی ذاتی محافل میں وہ میرا ذکر انتہائی طنزیہ انداز میں کریں گے اور مجھے کھلنڈرانہ طبعیت کا مالک لفنگا کہیں گے۔ وہ اپنے اُن بیٹوں کے سامنے میرے اوپر لعن طعن کریں گے جو میرے ساتھ خاص عزت و احترام سے پیش آتے ہیں اور مجھے مفید شہری خیال کرتے ہیں۔

سائکل ایک دلچسپ چیز ہے۔ یہ پہلے پہل آپ سے دوستی نہیں کرتی۔ یہ آپ سے دوستی کا آغاز باقاعدہ نفرت سے کرتی ہے۔ یہ آپ کو بار بار منہ کے بل گرا کر آزماتی ہے کہ اور آپ کا دوستی نبھانے میں مزاج معلوم کرتی ہے۔ کبھی کبھی یہ آپ سے اتنی تیز آگے چلی جاتی ہے کہ آپ بیٹھے بیٹھے پیچھے رہ جاتے ہیں اپنی کہنیاں ملتے اور گھٹنے دیکھتے رہ جاتے۔ کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ یہ اتنی قطعی یقین کے ساتھ رک جاتی ہے کہ آپ کو یقین کرنے کے لئے آگے کی طرف منہ کے بل گرنا پڑتا ہے اور بتیس میں سے دو تین دانت قربان کرنے پڑتے ہیں۔ طرح طرح کی ان آزمائشوں سے جب آپ نکل پاتے ہیں تب سائکل دوستی کا ہاتھ بڑھا لیتی ہے اور اپنی آغوش محبت میں گھیر لیتی ہے۔

آج یعنی ایک مہینے کے بعد سائکل نے میرے ساتھ دوستی کر لی ہے اب میں اس کی طبعیت سمجھ گیا ہوں اب میں نے اس کی چال ڈھال سے مطابقت پیدا کر لی ہے اب وہ مجھے گراتی نہیں ہے بلکہ وہ میرے وجود کا حصہ بن گئی ہے اور جب میں اس پر سوار ہوتا ہوں تو ایسا لگتا ہے جیسے وہ میرے اشاروں پر چل رہی ہے میں جو میں سوچتا ہوں اسی کے مطابق چلتی ہے، کہاں یکدم رک جانا ہے اور کہاں آہستہ آہستہ کھڑے ہو جانا ہے۔ یہ سب سمجھ گئی ہے اب اس کی مثال مطیع اور فرمانبردار بیوی کی ہوگئی ہے یا شاید میں سائکل چلانا سیکھ گیا ہوں۔

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

جو بے وقت گائے خلافِ توقع
تو جوتے ہی کھائے خلافِ توقع

سمجھ لو کہ بازار جائے گی زوجہ
وہ گر سر دبائے خلافِ توقع

جو تکلے کو کھولا تو شوں شوں ہوئی پھر
ہوا میں نہائے خلافِ توقع

ہے کنجوس کو کام ہم سے تبھی تو
کڑک چاء منگائے خلافِ توقع

یہ حسرت ہے مہماں جو اک ماہ سے ہے
کہے "بائے بائے" خلافِ توقع

کہیں جیب خالی نہ کردے تمہاری
گلے جو لگائے خلافِ توقع

ہنساتے ہنساتے ہوا حادثہ یہ
کہ آنسو بھر آئے خلافِ توقع

جو کھاتے تھے سر رات دن میرا مظہر
کھلاتے ہیں پائے خلافِ توقع

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

دیکھ کر تیرا رُخِ گلگوں سدا اچھا لگا
اس لئے ہی تو ہمیں ہر گلگلا اچھا لگا

اس کے ابا کی نظر ہے رات کی کمزور کچھ
ہم کو ہر دم شام کا یوں جھٹ پٹا اچھا لگا

ناز تتلاہٹ پہ جتلاؤ بھلا کیونکر نہ ہو
لڑکیاں کہتی ہیں تیرا بولنا اچھا لگا

اشتہاء انگیز آئی جس سے خوشبوئے حلال
چار پیسوں کا ہمیں وہ شوربہ اچھا لگا

اک نیا جوڑا اُچھلتا پھر رہا تھا باغ میں
ساتھ بلبل کے ہمیں وہ بلبلہ اچھا لگا

پل رہا ہے پھیپڑوں کی ہی کمائی پر جناب
"پلمونالوجسٹ" کو یوں پھیپڑا اچھا لگا

دل جلا محبوب ہم پر کر رہا تھا طنز یوں
تیری رنگت سے تو مجھ کو کوئلہ اچھا لگا

کیا بصارت اور بصیرت کا کہیں اس قوم کی
دھوکا جس جس نے دیا وہ رہنما اچھا لگا

نام کی تختی ہو یا پھر ہو تخلص کی مہر
ہر جگہ مظہر خود اپنا تذکرہ اچھا لگا

تنویر پھولؔ

نہ جانے یار کیوں شرما رہا تھا
بنا دولہا، لڑھکتا جا رہا تھا

مسلسل ٹرٹراہٹ سن رہے تھے
گٹر میں ایک مینڈک گا رہا تھا

بنا تھا ایک رہزن اپنا رہبر
تماشے نت نئے دکھلا رہا تھا

وہ لچھے دار تقریروں سے اپنی
دلِ اہلِ وطن برما رہا تھا

پراٹھے کھا کے موٹے ہو رہے تھے
سیاست کا توا جلتا رہا تھا

نظر آیا تھا بارہ من کا دھوبی
وہ چربی توند کی پگھلا رہا تھا

تھی شیطانی سی منہ پر مسکراہٹ
وہ اپنی آنکھ بھی چمکا رہا تھا

ہمیں دیکھا، چھپا بیت الخلا میں
ہُوا اے پھولؔ ! ایسا بارہا تھا

تنویر پھولؔ

پچھلی گلی سے چھپ کے سُوئے میکدہ چلے
سمجھے تھے شیخ جی کہ ہیں آسان راستے

مُلک اپنا گویا کھیت ہے، آتے ہیں بار بار
لیڈر چرندے بن گئے، دولت ہیں چر رہے

پبلک کو سبز باغ دکھاتے رہے ہیں وہ
آنے سے پہلے کرتے ہیں دعوے بڑے بڑے

اُس کی گلی سے دُور ہے، عاشق ہے نامراد
کتنے بنے رقیب ہیں، بھوں بھوں کیا کئے

دانشوری کا دعویٰ ہے لیکن پھرا دماغ
گھوڑوں گدھوں کے غول میں انسان پھنس گئے

کھا کر نہاری آئے تھے، بیگم نے یہ کہا
دیکھو جی! واش رُوم میں وہ کب سے ہیں گھسے

اپنے وطن نے پالے بہت آستیں کے سانپ
اب ان کے بعد راج کریں گے سپولئے

چوہے کی شادی جب ہوئی، بلی بنی دُلہن
بلے نے دودھ پی لیا چوہے کے سامنے

مفتی کے خاندان میں اک مولوی نے پھولؔ!
ڈیزل چھپا کے پیٹ میں ڈالر کما لئے

ڈاکٹر عزیز فیصل

تخلیق شعر چھوڑ، میاں "لائیاں" بنا
خود کو اہم ترین تو مثلِ فلاں بنا

مرتے ہیں تیرے دستِ شفا سے کئی مریض
اے ڈاکٹر کفن کی بھی اپنی دکاں بنا

تیرے تو بائیں ذہن کا ہلکا سا کام ہے
تُو میری خوبیوں کو مری خامیاں بنا

منطق کا تجھ کو میں بھی سمجھ لوں گا ماسٹر
ہٹ دھرم پینڈؤں کی کسی ناں کو ہاں بنا

لیلیٰ کی ماں نے قیس پہ رکھی یہ شرطِ عقد
جنگل میں اپنا ذاتی بڑا سا مکاں بنا

پہلے ہی خیر سے ہیں اٹھارہ کروڑ ہم
بوڑھوں کو اے حکیم نہ پھر سے جواں بنا

مہماں یہ ہاتھ جوڑ کے کہنے لگا عزیزؔ
ماحولِ شاعری کا نہ اے میزباں بنا

ڈاکٹر عزیز فیصل

رکھتے ہیں گلبدن پہ نہایت بری نظر
رنگیر، نیک پاک، پڑوسی، سگا سسر

تقریرِ اہلیہ میں کسی کو نہ مل سکے
کاماز، فل سٹاپ، خلا، زیر یا زبر

جائز ہیں سولہ آنے رقابت کے کھیل میں
بہتان، ٹوہ، سرچ، فسانے، سٹنٹ، شر

مہمان کو کھلائے گئے آٹھ روز تک
گھنگلو، کڑی، مسور، فرنیش بین اور مٹر

لائی ہے ایک شعر میں کیسے وہ شاعرہ
مس کال، آم، چیل، فری، سیٹھ، تھل، جگر

شوہر نہ اپنے آپ کو سمجھے تمام عمر
آزاد، رعب دار، بجٹ ساز، فائٹر

کرتا تھا ٹھیک ایک پڑی سے وہ درج ذیل
قولنج، موچ، زخم، فلو، چھینک، بال چر

وٹس ایپ کے بغیر بھی زندہ ہیں کس طرح
حشرات، بھوت، انس، پرند اور جانور

اے قیس، عاشقوں کا یہ ڈیٹا بتایئے
تعداد، لسٹ، قسم، گروپ، ٹیم اور فگر

عرفان قادر

ایسے سرتاج کو ملتی ہے ہدایت کم کم
جس کی سینڈل سے ہو کی جاتی مَرمت کم کم

کرتے رہتے ہیں یہاں گاؤں کے کنگلے بھی بہت
''شہر میں رزق تو وافر تھا محبت کم کم''

ووٹ لینا ہو تو در در ہیں بھٹکتے پھرتے
پھر نظر آتے ہیں اربابِ سیاست کم کم

پانچ دیوان ہیں چھپوائے ہوئے شاعر نے
پائی جاتی ہے مگر اُن میں فراست کم کم

جان! اِن بیوٹی کریموں پہ بھروسا مت کر
گورا کرتی ہیں چڑیلوں کی یہ رنگت کم کم

چائے پانی کے، لیے جاتے ہیں پیسے اکثر
اب کے دفتر میں چلا کرتی ہے رشوت کم کم

حد سے بڑھ جانے پہ ہے عشق دکھائی دیتا
پہلے آتی ہے نظر کوئی علامت کم کم

گھر سے باہر ہی اکڑفوں ہے نری، اور اندر
لال بیگوں سے بھی شوہر کی ہے دہشت کم کم

فیس بک کو بھی ذرا وقت دیا کر رانجھے
اپنے شیڈول میں رکھ بھینس کی خدمت کم کم

اگلے وقتوں میں نہیں جاتی تھی بجلی ہرگز
اور اب آتی ہے یہ ماسی مصیبت کم کم

ہوں شکم سیر تو بالکل نہ دولتی جھاڑیں
پائی جاتی ہے گدھوں میں یہ روایت کم کم

یوں تو وہ شہر میں مشہور ہے چوٹی کا وکیل
سامنے چلتی ہے بیگم کے وکالت کم کم

جب سے چھایا ہوا ''سی پیک'' ہے خیالوں میں جناب
مینڈکوں سے انہیں ہوتی ہے کراہت کم کم

ہم سمجھتے رہے شرمائے گا، مُلّا ہو کر
میم کو دیکھ کے بول اُٹھا وہ حضرت ''کم! کم!''

پہلوانوں کی غزل سن کے نہ جو واہ کہیں
ہاتھ پاؤں ہیں رہے اُن کے سلامت کم کم

عرفان قادر

چُوچک کی اور ہیر کی ہمسائیگی سے بچ
رانجھے میاں کی بے سُری سی بانسری سے بچ

جنگل کے جانور ہیں بڑے ہی ضرر رساں
لیکن یہ مشورہ ہے مرا آدمی سے بچ

بھوسا بھرا ہوا ہے تو وہ بھی نہیں درست
خالی تمام تر ہے جو، اُس کھوپڑی سے بچ

نا اہل ہو کہ اہل ہو، دونوں ہیں ایک ہی
اے قوم! لیڈران کی نالائقی سے بچ

مہلک ہیں یوں تو سارے جراثیم ہی مگر
تُو آج کل کی نثر نما شاعری سے بچ

کھا تو نہ جائے گا وہ تجھے، حوصلہ بھی رکھ
افسر سے کھا نہ خوف، مگر افسری سے بچ

سُسرالیوں نے تیز بڑی کی ہے آج کل
سی آئی ڈی سے بچ، ارے! سی آئی ڈی سے بچ

جو چیز لے تو چھان پھٹک کے خرید کر
ٹی وی پہ اشتہار کی جادوگری سے بچ

ملتے ہیں خونخوار وہاں پر بڑے بڑے
جتنا بھی ہو سکے، تُو صنم کی گلی سے بچ

میں جانتا ہوں کام یہ آساں نہیں مگر
طنز و مزاح ٹھیک ہے، بے ہودگی سے بچ

سالک جونپوری

بنائیں پکوڑے تو بیسن ہمارا
ہو ادرک تمہارا تو لہسن ہمارا

اب افطار بھیجیں گے تھیلی میں ان کو
نہیں کرتے واپس وہ برتن ہمارا

بنایا ہے اک بجلی گھر اپنے اندر
"مقدر مسلسل ہے روشن ہمارا"

یہ پتلون پر اپنا کرتا چڑھا کر
دکھاتے ہیں باقی ہے دامن ہمارا

کڑک دھوپ سے ایسی حالت ہے توبہ
ہو سورج پہ جیسے نشیمن ہمارا

محبت کی خاطر ہے رکھا بڑا دل
برابر میں بیٹھے گا دشمن ہمارا

گلوں سے مجھے اتنی الفت ہے سالک
پتہ کوئی پوچھے تو گلشن ہمارا

سالک جونپوری

اپنے پیدا کیئے حالات سے ڈر لگتا ہے
جیتنا فرض ہو جب مات سے ڈر لگتا ہے

تلخیاں جھیل کے آیا ہوں یہاں تک تو مگر
تلخ گزرے ہوئے لمحات سے ڈر لگتا ہے

دوبدو ہو کے جو کہنا ہے تجسس میں رہا
دل میں جو بات ہے اس بات سے ڈر لگتا ہے

سیدھے رستے پہ ہی چلنے کا ارادہ تو کیا
پھر بھی بگڑی ہوئی عادات سے ڈر لگتا ہے

یوں تو دلچسپ ہے بارش کا یہ موسم لیکن
ٹھنڈ بڑھ جائے تو برسات سے ڈر لگتا ہے

ہم تو جذباتی ہی مشہور ہیں کیسے لکھ دیں؟
ایک جذباتی کو جذبات سے ڈر لگتا ہے

علیم اطہر

آئی ایم ایف کو تو اب میزان ہونا چاہیے
یورپ و امریکہ کو سوڈان ہونا چاہیے

ایک بیلن اور چمٹا، ہیل والا جوتا بھی
"گھر میں کھانے کا بھی کچھ سامان ہونا چاہیے"

میں ہوں کنوارہ کوئی رن بھی اڑ کے ناں چڑھی
رن کے بدلے اب تو شاید ران ہونا چاہیے

ٹن ٹنا ٹن، ٹن ٹنا ٹن، ٹن ٹنا ٹن، ٹن ٹنا
کن ٹٹے کا بھی آخر کان ہونا چاہیے

کہہ دو ملاں کو مسیتے جا کے بانگے "ککڑوں کوں"
انڈہ مرغی نے دیا اعلان ہونا چاہیے

بندہ خاکی تیرے گھر میں لان ہونا چاہیے
خاک زادی آؤ اب میلان ہونا چاہیے

تو ہے پھپھے کٹنی سی یونہی مکر کرتی ہے پھر
لنڈی کوتل ہی کو پھر مکران ہونا چاہیے

واسکوڈے گاما کو گامے نے کوڈا کر دیا
بھولو، جھارا ہی کا پھر ارمان ہونا چاہیے

گھم گھماٹا، لاہ دو گاٹا، موج مستی، خوب کر
غل غپاڑہ، ٹھاہ ٹھا، گھمسان ہونا چاہیے

چک دے پھٹے، ہڈی پسلی، کھوپڑی بھی توڑ دے
اس جوانی پر سبھی کو مان ہونا چاہیے

سب ہیں بھوکے اور لنگر مُک گیا دربار پر
عرس ہونا چاہیے رمضان ہونا چاہیے

علیم اطہر

تکیہ بھی ٹیڑھے ٹیڑھے ذرا گول کیجیے
پاؤں پسارئیے تو پھرے ڈھول کیجیے

اوزان میں بحور میں ڈنڈی نہ ماریے
زنجیرِ عدل کھینچ کے پھر تول کیجیے

قطعہ، رباعی، گیت، غزل، نظم سب فضول
آئندہ صدرِ بزم بھی بغلول کیجیے

خود کو بھی تپ چڑھائیے، قاری کا سر پھٹے
اسلوبِ ایلیائی پہ لاحول کیجیے

مشکل ردیف ٹھونسیے، الجھے سے قافیے
یوں ہر غزل کو آپ ہی انمول کیجیے

بجری ہیں حرف حرف، تخیل ہے تارکول
اب شاہراہِ عام کا ماحول کیجیے

لوٹو مشاعرہ کہ ہلاکو ہو تم سبھی
دل باغ باغ داد پہ، منگول کیجیے

تگڑے مخالفین ہیں پھر کھیل چھوڑیے
اپنی ہی سمت آپ ذرا گول کیجیے

حاسد جلا بھنا ہے وہ چھوڑے گا پھر دھواں
انجن ہے کوئلے کا تو پٹرول کیجیے

سکے تمہارے نام سے جاری کیے تمام
دامن بھرا ہوا ہے تو کشکول کیجیے

کچھ تو پتہ چلے کہ پڑھا ہے مشاعرہ
اب داد تو ملی نہیں چھترول کیجیے

محمد خلیل الرحمٰن خلیل

نہ دلنشیں نہ کوئی مہ جبیں نہ نازنیں ہو
پھر اپنے آپ کو تم ہیر کیوں سمجھتی ہو ؟

ہمارے دل میں چلی آتی ہو بنا، پوچھے
یہ اپنے باپ کی جاگیر کیوں سمجھتی ہو ؟

میں مانتا ہوں کہ تنویر نے دیا دھوکا
ہر ایک شخص کو تنویر کیوں سمجھتی ہو؟

جو آج ہم نے پکائے ہیں شوق سے چاول
یہ بے لذیذ سی تم کھیر کیوں سمجھتی ہو؟

مرا رقیب تو فیشل کرا کے آتا ہے
اسے کمال کا شہ میر کیوں سمجھتی ہو؟

جو ڈورے ڈالنے میں ہوگئے ہیں سب ناکام
وہ ڈھونڈ ہیں انہیں دلگیر کیوں سمجھتی ہو

خلیل تیرے حسیں جال میں نہ آئے گا
مجھے بھی قابلِ تسخیر کیوں سمجھتی ہو؟

محمد خلیل الرحمٰن خلیل

دن رات عشق مجھ کو بناتا ہے بیوقوف
سپنے نئے نئے یہ دکھاتا ہے بیوقوف

جب آئینے میں خود کو کبھی ڈھونڈنے لگوں
یہ عکس یار کا ہی سجاتا ہے بیوقوف

پوچھوں رقیب سے جو کوئے یار کا پتہ
ہنس ہنس کے مجھ کو مجھ پہ ہنساتا ہے بیوقوف

ناصح کی بات سچ ہے کہ اُن کو نہیں ہے پیار
کیوں اُس گلی مین خاک اُڑاتا ہے بیوقوف

شائد یہ سوچتا ہے کہ کامل نہیں وجود
ہر خواب میں ہی چاک گھماتا ہے بیوقوف

مجھ رتجگے کے وصل کی امید پہ یہ دل
دھک دھک کے لوریوں سے سلاتا ہے بیوقوف

کیوں چارہ گر کے پند و نصائح سُنے خلیل
کیا بات کام کی یہ بتاتا ہے بیوقوف

گوہر رحمٰن گہر مردانوی

فن کی گرمی ہے فین کوئی نہیں
من کی مرضی ہے مین کوئی نہیں

کچھ بھی کہتا نہیں کرنٹ مرہ
پن کی بجلی ہے پین کوئی نہیں

شب چڑھانے کی کوششیں کرلیں
چن تھی موجود چین کوئی نہیں

دیکھ پاؤں تلے دبی رحمت
لانگ رن پر ہے رین کوئی نہیں

کچھ ذرا دیں گہر تو آ جائیں
گن اٹھاؤ کہ گین کوئی نہیں

گوہر رحمٰن گہر مردانوی

طیش سے بیگم جہاں بھی لال پیلی ہوگئی
شوہر بے نام کی پتلون گیلی ہوگئی

دوڑتا آیا کہ جو ہم زلف مردانے میں ہے
خوف سے رنگت ہماری خوب نیلی ہوگئی

ایک پھنے خان ڈینگیں مارتا تھا بار بار
دیکھ کر خطرہ وہیں شلوار ڈھیلی ہوگئی

تنگ آ کر ایک سے دوجا رچا بیٹھا بیاہ
اور بیوی بھی تو بیوی کی سہیلی ہوگئی

ایک من اک وقت میں کھاتے ہوئے کہتی رہی
بھوک سے اسے سوکھ کر ناترس تیلی ہوگئی

گوہری افکار سن کر مخمصے میں پڑ گئے
سوچ گنجلک یوں کہ جیسے اک پہیلی ہے

نورؔ جمشید پوری

محفل میں آکے ہاتھ ملانے کا شکریہ
غیروں سے مجھ کو اپنا بتانے کا شکریہ

دل کو یقیں تھا شعر چراتے ہو تم مگر
میری غزل مجھ ہی کو سنانے کا شکریہ

سر میرا اونچا فخر سے تم نے تو کر دیا
میکے میں آکے مجھ کو منانے کا شکریہ

جا کر کچن میں مجھ سے پکایا گیا نہ جب
ہوٹل میں لاکے لنچ کرانے کا شکریہ

میری سہیلیوں کی تواضع کے واسطے
بریانی تازہ تازہ پکانے کا شکریہ

مہنگی دلا کے ساڑیاں اور تھوڑے زیورات
میری پڑوسنوں کو جلانے کا شکریہ

اٹھنے سے قبل میرے، بنا کر مرے لئے
بستر پہ مجھ کو چائے پلانے کا شکریہ

آتی ہے نیند سن کے جو نغمے مجھے وہی
ہر شب سنا سنا کے، سلانے کا شکریہ

مہندی لگا کے بیٹھی تھی جب نام کی ترے
ہاتھوں سے مجھ کو کھانا کھلانے کا شکریہ

چاہت تمام الفتیں مجھ پر لٹا کے پیار
چہرے کا میرے نورؔ بڑھانے کا شکریہ

قمرؔ آسی

ایسا نہیں کہ یار کا رستہ نہیں ملا
رستے کا علم تھا، مجھے رکشہ نہیں ملا

تنقید کر رہا ہے حکومت پہ آج وہ
لگتا ہے اس کو آج کا خرچہ نہیں ملا

لکھی بنامِ منتظم اِک لمبی چوڑی ہجو
بعد از مشاعرہ جو لفافہ نہیں ملا

پیدائشی جوان ہیں اطفالِ عہدِ نو
دورِ جدید میں ہمیں بچہ نہیں ملا

سوچا ہے پردے کے لیے خیمہ خرید لوں
برقعوں میں آج کل کے تو پردہ نہیں ملا

دعوت اڑائی یار کے نمکین حسن کی
میٹھے سے تھا پرہیز سو بوسہ نہیں ملا

جہانگیر نایاب

اپنا چشمہ نظر نہیں آتا
ورنہ کیا کیا نظر نہیں آتا

سارے پکوان ہیں پلیٹوں میں
کوئی حلوہ نظر نہیں آتا

سالیوں پر ہی التفات یہ کیوں
ایک! سالا نظر نہیں آتا

دیکھ لیتا ہوں ایک سوئی میں
تم کو بھینسا نظر نہیں آتا

نقص سب میں تلاش کرتا ہوں
عیب اپنا نظر نہیں آتا

آ تری آج پھر خبر لوں میں
میرا ڈنڈا نظر نہیں آتا

آ گئے گاؤں کے سبھی لڑکے
صرف! کلوا نظر نہیں آتا

درمیاں ان حسین چہروں کے
میرا سالا نظر نہیں آتا

بیویاں چار ہیں تری لیکن
کوئی بچہ، نظر نہیں آتا

کیسا مقطع ہے تیرا یہ نایاب
ثانی مصرعہ نظر نہیں آتا

سید فہیم الدین

اب اس طرح شباب ہے اُس کا نقاب میں
جیسے کہ دستیاب ہو ہڈی کباب میں

تاثیر و ذائقہ ہے مشابہ جلاب سے
''ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں''

کہنے کو اُس کو پھول تو کہہ دیں گے ہم مگر
گوبھی کا کوئی پھول ہو جیسے گلاب میں

پھر کس طرح سے اُن کا نہ میرٹ بنے حضور
حل کر رہے ہیں رکھ کے وہ پیپر کتاب میں

لوگوں میں اب وفا ہے یونہی ڈولتی ہوئی
سوہنی کا جس طرح سے گھڑا ہو چناب میں

مرزا عاصیؔ اختر

سر پٹخنے کا سبب یاد آیا
تیری پاپوش تھی اب یاد آیا

قرض ہم اُس کا چکاتے لیکن
جب وہ رخصت ہوا، تب یاد آیا

گالیاں آپ کے منہ سے سُن کر
آپ کا نام و نسب یاد آیا

یونہی جا پہنچے، لگایا نہ خضاب
اُس نے ''چاچا'' کہا، تب یاد آیا

بھوت جیسی تھی وہ صورت عاصیؔ
''دل دھڑکنے کا سبب یاد آیا''

روبینہ شاہین بیناؔ

لیڈر بنے نہ خود کو وہ ذی جاہ کئے بغیر
منزل نہ پائے اوروں کو گمراہ کئے بغیر

رینگے نہ اب پیادہ بساطِ دیار میں
بازی نہ جیت پائے گا چت شاہ کئے بغیر

یہ بھوت ''عشق وشق'' کا ایسا ہے لاجواب
جاتا نہیں ہے دل کو بھی جنگ گاہ کئے بغیر

ہوتی نہیں ہے ہضم تری شاعری مگر
چلتا نہیں مشاعرہ بھی واہ کئے بغیر

کیوں ریٹ گھر میں آج خوشامد کا تیز ہے
ملتی نہیں ہے چائے بھی اب چاہ کئے بغیر

ایسا نہیں ہے کوئی ڈرامہ جو دیکھئے
جس سے سبق ملے کوئی گمراہ کیے بغیر

سچ ہے خدا کے بید کی آواز ہی نہیں
شامت میاں کی آئی ہے آگاہ کئے بغیر

قاتل نگاہِ ناز کی پھرتی نہ پوچھیے
بندے کو مار دیتی ہے ٹھاہ ٹھاہ کیے بغیر

لگتا تھا ڈاکٹر بھی کسی میرؔ کا اسیر
پوچھا نہ مجھ مریض کو آہ آہ کیے بغیر

انداز اُس کا ایسا تھا، بیناؔ نہ پوچھئے
رہتا نہیں ہے تاڑو کبھی، آہ کئے بغیر

امین نیر

گھر میں نہ شور ہے نہ کیا ہے نہ کیوں ہے، یوں ہے
اہلیہ میکے گئی ہے تو سکوں ہے، یوں ہے

یہ تو باہر کی ہے اپنی سبھی پھنے خانی
ورنہ سر اپنا سدا گھر میں نگوں ہے، یوں ہے

جیب خالی مری رہتی ہے جو اکثر یارو
یہ تو سب اس کی اداؤں کا فسوں ہے، یوں ہے

کیا کریں ہم تو چلاتے ہیں پرانی گاڑی
خرچ فیشن کا بھی تو حد سے فزوں ہے، یوں ہے

استرا سر پہ پھرایا ملی خشکی سے نجات
اب تو سر میں ہے کوئی لیکھ نہ جوں ہے، یوں ہے

آج کی لیلیٰ کو فرصت کہاں موبائل سے
قیس آوارۂ صحرائے جنوں ہے، یوں ہے

اک نظر پڑتے ہی تو ہوش و خرد کھو بیٹھا
اس طرف سے تو ابھی ہاں ہے نہ ہوں ہے یوں ہے

جس کی خاطر ہوئے ہم چاک گریباں اُس نے
ہم کو دیکھا تو کہا ''اوئے یہ توں ہے'' یوں ہے

صبر آیا ہے ہمیں کر کے مچھتراں عشق
لب پہ اب کوئی فغاں ہے نہ فغوں ہے یوں ہے

مستند شعر و سخن میں ہے ترا نام فراز
شعر نیر کا ترے آگے زبوں ہے یوں ہے

ظہیرالدین عشؔ

تنخواہ سے تمھاری تو گزارہ نہیں ہوتا
میک اپ بھی تو پورا یوں ہمارا نہیں ہوتا

چہرے پہ کریمیں کیوں لگا لیتی ہے اتنی
اتنا بھی سیاہ رنگ تمھارا نہیں ہوتا

کی ہوتی جو بیوی نے ذرا گھر کی صفائی
ہاتھوں میں ہمارے یہ بہارا نہیں ہوتا

موجود ترا باپ ہے انگنائی میں جب سے
گزران وہاں سے تو ہمارا نہیں ہوتا

کی ہوتی نظر اس پر اگر ماہ جبیں نے
تو عشؔ ترا آج کنوارہ نہیں ہوتا

نوید ظفر کیانی

چوروں کی سیاست بھی تماشے کی طرح ہے
اب اپنی معیشت بھی بتاشے کی طرح ہے

بڑھکیں کسی پنجاب کے ہیرو کی طرح ہیں
صحت کوئی دیکھے تو وہ لاشے کی طرح ہے

کب توند تمنا کی بھری جائے گی اس سے
امید کا پیکج بھی تو ساشے کی طرح ہے

لیڈر میں بھی در آئے ہیں اطوار زنانہ
تولے کی طرح ہے کبھی ماشے کی طرح ہے

وہ خط بھی جو لکھتا ہے تو کیا دھانسو قسم کا
چالان کے مرقوم تراشے کی طرح ہے

کیا جانئے، بھر جاتا ہے کیوں چھالے زباں پر
جو آم کے کاٹے ہوئے قاشے کی طرح ہے

باور نہ کرا پایا میں بچھڑے ہوئے خاں کو
"جی آیاں نوں" سرکار کے "ناشتے" کی طرح ہے

ظالم نے "چول پن" کا نیا رنگ نکالا
مرزے کی طرح ہے نہ وہ پاشے کی طرح ہے

پھٹکار بھی اُس پر ہے، مرا پیار بھی ہے وہ
وہ بت کہ سیاست کے مہاشے کی طرح ہے

نوید ظفر کیانی

ہم تم بنامِ عقد سزاؤں پہ متفق
سب لوگ اپنی اپنی بلاؤں پہ متفق

مہماں ولیمے میں ہیں سلامی کے بھاؤ پر
توندوں میں ہفتے بھر کی غذاؤں پہ متفق

ہم لا رہے تھے بزم میں نطاق و مطربہ
تم ہو گئے ہو خواجہ سراؤں پہ متفق

بلیوں سے اُن کے ٹھہرے مفادات مشترک
کتے بھی ہو چلے ہیں "میاؤں" پہ متفق

اب نام و سام اپنے مقدر کے ساتھ ہیں
بہرِ غلامی سب ہیں پچھاؤں پہ متفق

بابو ہیں مک مکا کی سہولت لئے ہوئے
اور سائلین عقدہ کشاؤں پہ متفق

کتنا ہے احترامِ ہوسِ نظر انہیں
سارے ہی بُت ہیں تنگ قباؤں پہ متفق

یہ کیسا تیَن باندھا گیا روزگار کا
شہروں سے مطمئن ہیں نہ گاؤں پہ متفق

اپنی تو موج مے پہ چڑھاتے ہیں ناک بھوں
مغرب سے اُٹھنے والی گھٹاؤں پہ متفق

لڑتے ہیں جو زمین کے ایک ایک انچ پر
کل ہوں گے شاملات خلاؤں پہ متفق

اہلِ سخن میں چینی کی صورت ہے یہ ظفر
سب ہیں غزل کی شوخ اداؤں پہ متفق

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

شعبۂ امراضِ جلد

جلد ہماری معاشرتی زندگی میں انتہائی اہمیت کی حامل ہے۔ ہمارے حسن پرست گوری چمڑی پہ جان چھڑکتے ہیں لہٰذا جلد کے ڈاکٹر ہوں یا بیوٹیشن دونوں کے لئے یہ شعبہ بہت نفع بخش ہے۔ رقبے کے لحاظ سے بھی جلد ہمارے جسم کا سب سے بڑا عضو ہے۔ شعبہ جلد کا ماہر نہ صرف جلد بلکہ اس کے علاوہ بالوں اور ناخنوں کے امراض کا بھی علاج کرتا ہے۔

اِسکن اسپیشلسٹ

بہت سے ڈاکٹر اس شعبے میں صرف اس لئے تخصیص حاصل کرنا چاہتے ہیں کہ اس میں ایمرجنسی نہیں ہوتی۔ لہذا ہر وقت ہائی الرٹ نہیں رہنا پڑتا، روزانہ کی ٹینشن اور کچھ کچھ بھی اعصاب پر برا اثر نہیں ڈالتی۔ اور جلدی امراض بہت جلد ٹھیک ہونے والے بھی نہیں ہوتے لہٰذا مریض کی آمد و رفت اور ڈاکٹر کا کاروبار جاری و ساری رہتا ہے۔ لہٰذا ماہر جلد بڑے پر تیقن انداز میں کہتا نظر آتا ہے ؎

حاذق الملک نہ کوئی بھی رہا میرے بعد
کون دے گا تجھے کھجلی کی دوا میرے بعد

مجید لاہوری

خارش

منہ لال گلابی تو ہے صحت کی نشانی
خارش ہے یقیناً ہوئی، گر جسم ہوا سرخ

عرفان قادر

خارش جلد کی سب سے زیادہ ہونے والی بیماری ہے۔ جس کی بے شمار وجوہات ہیں، ان میں سے کچھ متعدی اور کچھ غیر متعدی بیماریاں ہیں۔ معاشرتی اعتبار سے یہ ایک بہت پریشانی

والی بیماری ہے کہ خارش بغیر موقع محل جب چاہے اور جہاں چاہے کی بنیاد پر فوری وقوع پذیر ہو جاتی ہے اور نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن کے مصداق مریض بے چارہ شش و پنج میں پڑ جاتا ہے کہ خارش کرے یا نہ کرے۔

ہر کوئی جسم کو کھجاتا ہے
اتنا بدحال کر دیا پت نے

ممتاز راشد

یہ خارش ہے یا صبر کا امتحاں
یہ خارش ہے یا لذتِ جسم و جاں
یہ خارش ہے یا نظمِ آزاد ہے
یہ خارش ہے یا کوئی نقاد ہے
یہ خارش ہے یا حاسدوں کی جلن
یہ خارش ہے یا دوڑتے ہیں ہرن
یہ خارش ہے یا دست کھجلیں کا کھیل
یہ خارش ہے یا کوئی طوفان میل
یہ خارش ہے جذبات کی ترجماں
پیانو پہ یہ ناچتی انگلیاں
ارے میری خارش غضب ہوگیا
کھجانا خلاف ادب ہو گیا

شبنم رومانی

کیا مرض کا پوچھتے ہو حال خارش ہوگئی
ڈاکٹر نے بھی اتاری کھال خارش ہوگئی
ڈاکٹر سے لے کے آئے تھے جو خارش کی دوا
چند منٹ میں اڑ گئے ہیں بال خارش ہوگئی
آئے تھے آرڈر پہ لیکن سارے جھاویں بک گئے
پڑ گیا ہے شہر بھر میں کال خارش ہوگئے

سیّد فہیم الدین

دوا اے ''ڈرمٹالوجسٹ'' دے دے
مگر پہلے مری سُن لے گذارش
یہ بیماری بھی خارش کی عجب ہے
کہ اس کے ذکر سے ہوتی ہے خارش

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

جب بھی دکھایا ماہرِ امراضِ جلد کو
تشخیص میں وہ اُلجھا بہت کسمسائے ہاتھ
خارش ہمارے ہاتھ کی، دولت نہ لا سکی
اپنی تو جیب خالی ہوئی جب دکھائے ہاتھ

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

تو اِس قدر نہیں دشمن کہ بدؤعائیں دوں
کھرک لگے نہ کہیں تیرے دست و بازو کو

نوید ظفر کیانی

متعدی خارش

اس بیماری کو طبی زبان میں اسکیبیز scabies کا نام دیا گیا ہے جو ایک چھوتی بیماری ہے اور بیماری سے زیادہ مصیبت زیادہ ہے کہ اس کا شکار مریض پورے گھر میں یہ بیماری پھیلا دیتا ہے۔

مبتلا ہوں تبھی سے خارش میں
آپ جب سے قریب آئے ہیں

مرزا عاصی اختر

طب کے ماہر نے خبردار مجھے کرکے کہا
دیکھ کر ہاتھ ملا گر ہو وہ دانے والا
تجھ کو بیماری لگا دے نہ کہیں خارش کی
''دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا''

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

ہم کہے جاتے ہیں لگ جائے گی تم کو بھی کھرک
وہ زبردستی گلے ہم سے ملے جاتے ہیں

سیّد سلمان گیلانی

للہ چارہ گر مری خارش کی فکر کر
اُن کو گلے لگائے زمانے گزر گئے

عنایت علی خان

خارش کا علاج

سن کر بات معالج کی
کیوں نہ کروں اس پر رٹ
کھجلی پر یہ رائے دی
you will have to live with it

انور مسعود

تم پہلے میرے ناخنِ تدبیر دیکھ لو
مجھ کو تمہاری پیٹھ کھجانے میں کچھ نہیں

خالد عرفان

گرمی دانے

آستیں اپنی چڑھا کر وہ یہ بولے مجھ سے
دیکھ گرمی سے نکلتے ہیں یہ دانے میرے

سیّد اطہر جعفری

نکلتے ہیں گرمی میں دانے کہ مظہر
فقط ہوتی ہے گرمی دانے میں گرمی

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

سورج مکھی

باپ ماں ہیں ماہ رو اولاد سب سورج مکھی
رات دن رہتا ہے گھر میں اک سماں تنویر کا

ناظر ٹونکی

چھائیاں

تنخواہ گرچہ ساری کریموں پہ اٹھ گئی
چہرے پہ رقص کرتی وہی چھائیاں رہیں

مرزا عاصی اختر

مہاسے

منفرد کوئی نشانی تری پہچان کی ہو
ناک پر ایک مہاسا بھی ضروری ٹھہرا

عرفان قادر

کوڑھ

اے جانِ جہاں چاہنے والوں سے یہ نفرت
بیمار ترا کوڑھ کا بیمار نہیں ہے

حاجی لق لق

تل

جلد پر تل کبھی شناختی نشان ٹھہرتے ہیں تو کبھی "تیرے مکھڑے پہ کالا کالا تل" کی صورت میں عشاق کے لئے باعث حسن ہوتے ہیں، لیکن کبھی کبھی ایسی جلدی بیماریاں مریض کو بہت مشکل میں ڈال دیتی ہے جن میں سارا جسم تلوں سے بھر جاتا ہے اور ان کا کوئی خاص علاج بھی نہیں ہوتا

رخِ زیبا پہ دیکھ کر یہ تل
یہ بتا کیوں نہ تلملاؤں میں

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

لکھ ڈالے شاعروں نے جو اشعار بے شمار
ایسا کہاں کا حسن ترے تل میں پڑ گیا
احمد علوی

میک اپ زدہ دلہن سے تھا دولہا کا یہ سوال
وہ تل کہاں گیا ترا گالوں کے آس پاس
ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

اُن کے ہونٹوں پہ ہے اور ان کے ہے رخسار پہ تل
تلملانے کی اجازت نہیں دی جائے گی
عنایت علی خان

جلدی امراض کے علاج

جلدی امراض کے علاج طویل اور صبر آزما ہوتے ہیں۔ جس سے اکثر اوقات مریض زچ بھی ہو جاتا ہے۔

ایک ماہر جلد کا کہتا تھا یوں
سرسوں جمتی ہے ہتھیلی پر کہیں؟
آتا ہے آرام یاں آرام سے
جلد کا شعبہ ہے جلدی کا نہیں
ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

لیزر

یوں ملا پیشنٹ اک کہتا یہ آج
لٹ گیا میں ہائے رے ظالم سماج
چند لمحے کچھ شعاعیں ڈال کر
لے اُڑا ہے سارا زر "لیزر" علاج
ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

بال

ایسا ممکن نہیں کہ شاعری ہو اور محبوب کے سراپے میں محبوب کی زلفوں کا ذکر نہ ہو۔ اردو کے قدیم شاعروں میں سترہ ویں صدی کے شاعر محمد شاکر ناجی بھی شامل ہیں۔ زلف محبوب کے بارے میں وہ یوں رقمطراز ہوتے ہیں۔

زلف کے حلقے میں دیکھا جب سے دانہ خال کا
مرغ دل عاشق کا تب سے صید ہے اس جال کا
گندمی چہرے کو اپنی زلف میں پنہاں نہ کر
ہندواں سن کر مبادا شور ڈالیں کال کا
محمد شاکر ناجی

یوں ہے صنم کی زلف سیاہ فام پر نگاہ
رہتی ہے روزہ دار کی جوں شام پر نگاہ
شیخ ظہور الدین حاتم

یہ تری زلف کا کنڈل تو مجھے مار چلا
جس پہ قانون بھی لاگو ہو وہ ہتھیار چلا
اظہر شاہ خان

خشکی

مگر جب یہ ریشمیں زلفیں بیماری کا شکار ہو جاتی ہیں، تو لوگ عالمِ پریشانی میں ماہر امراض جلد کے مطب کے چکر لگانے پہ مجبور ہو جاتے ہیں۔

سچ ہے انسان کسی حال میں رہتا نہیں خوش
اس سے واضح تو ہوا خیر سے انسان ہیں ہم
ناخدا جب تھے تو خشکی کو ترستے تھے بہت
آج سر پر جو ہے خشکی تو پریشان ہیں ہم
عبدالحکیم ناصف

خضاب

سفید بال اگر دھوپ کی عنایت ہیں
تو ہم بھی چہرے پہ کچھ دھوپ مل کے دیکھتے ہیں
شہزاد قیس

میں رنگ پیری میں بھر رہا ہوں
خضاب سے بن سنور رہا ہوں

حاجی لق لق

کرتے ہی لیپ ابا کے سب بال اڑ گئے
اماں بھی سر چھپائے ہوئے ہے حجاب میں
اب ڈر رہی ہے بالوں کو کرنے سے "ڈائی" وہ
"بھابی نے کچھ ملا نہ دیا ہو خضاب میں"

خالد محمود

پیری ہے اور خضاب لگانے لگا ہوں میں
گویا نیا ہی چاند چڑھانے لگا ہوں میں

نوید ظفر کیانی

دیکھا جو زلف یار میں کاغذ کا ایک پھول
میں کوٹ میں گلاب لگا کر چلا گیا

پوڈر لگا کے چہرے پہ آئے وہ میرے گھر
میں اُن کے گھر خضاب لگا کر چلا گیا

سرفراز شاہد

جوئیں

گر ہی جائیں گی سب پھسل کے جوئیں
زلف ساجن کی ریشمی ہو گی

عرفان قادر

رہ رہ کے گرفتار ہوئی جاتی ہیں جوئیں
تو نے جو بچھایا ہوا زلفوں کا یہ جال است

عرفان قادر

اس سے اندیشہء فردا کی جوئیں جھڑتی ہیں
سر کھجانے کی اجازت نہیں دی جائے گی

عنایت علی خان

شیمپو

الگ ہے جووں کا شیمپو الگ ہے ہے خشکی کا
نہیں ہے کوئی بھی اس دور میں کسی کے لئے

عرفانؔ قادر

کیسے کیسے تیل اور شیمپو سر پہ ہم نے ملے لیکن
آئے دن اپنا یہ ماتھا اور کشادہ ہو جاتا ہے

ڈاکٹر بدرؔ منیر

سامنے میرے ملی چہرے پہ دلبر نے کریم
اس طرح گویا وہ میرے دل پہ مکھن مل گیا

حاجی لق لقؔ

گنجا پن

گنج بھلا کس کو پسند ہے۔ گنجے حضرات ہمیشہ لوگوں کے تمسخر کا نشانہ بنتے رہے ہیں۔ مزاحیہ شعرا نے اس پر بہت کچھ لکھا ہے۔

تصورات میں فٹ بال سا اچھلتا ہے
کبھی جو کنگھی میں ہم بال سر کے دیکھتے ہیں

ڈاکٹر بدرؔ منیر

جس طرح سیپ رکھتی ہے موتی سنبھال کر
جیسا کہ چند بیج بھی ہوتے ہیں سیب میں
اس کی بلا سے اور کوئی چیز ہو نہ ہو
کنگھی ضرور ہوتی ہے گنجے کی جیب میں

خالدؔ محمود

تمہارے پھپھا وہ گنجے والے جو لے گئے تھے اُدھار کنگھی
مہینہ ہونے کو آ گیا ہے نہ اس نے ''دی'' نہ ہم نے ''منگی''

خالدؔ مسعود

کیا یہ کہنا گنج کی توہین ہے
یہ بھی گویا ایک ٹچ اسکرین ہے

ڈاکٹر عزیزؔ فیصل

نہیں چاہتا ہوں میں گنجوں کو گرچہ
مگر خود بھی گنجا ہوا چاہتا ہوں

عرفانؔ قادر

جب اس زلف کی بات چلی
گنجے روئے گلی گلی

طٰہٰؔ خان

یہ کیسی گنج ہے دیتے ہیں جس کا سب طعنہ
اگرچہ بالوں کا سر پہ کوئی خزانہ نہیں

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی
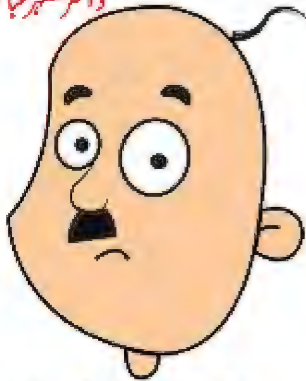
ہمارے مردانہ معاشرے میں گنجے عاشق کو تو برداشت کیا جا سکتا ہے لیکن اگر صورتحال اس کے برعکس ہو تو معاملہ گھمبیر صورت اختیار کر لیتا ہے۔

کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے
ہر شخص کے لئے یہ مصیبت کی بات ہے
عاشق کا گنجا پن تو نہیں بات عیب کی
محبوب گنجا ہو تو قیامت کی بات ہے

سکارؔ لکھنوی

پہلے تو بال اس کے سراسر طویل تھے
اب بال کیا کہ سر بھی ہے میدان کی طرح

سید فہیم الدین

گنجے پن کے فوائد

سنوار لیتے ہیں ہاتھوں سے زُلفِ بے پرواہ
یہ چند بال تو منت پذیرِ شانہ نہیں

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

جو سچ پوچھو تو چندیا ہے ہمارا نیچرل ہیلمٹ
سکندر ہو کہ دارا بال بیکا کر نہیں سکتا

صبغات اللہ بمباٹ

یہ اک میک اپ ٹپ ہے گنجے یارو سن لو
ٹاکی سے سر کو ''لشکایا'' جاسکتا ہے

عتیق الرحمٰن صفی

گنجوں کے مسائل

مت کسی ٹنڈ کا اڑاؤ مذاق
چاند ہوگا نہ چاندنی ہوگی

عرفان قادر

'فارغ البال' کی سرحد نہیں واضح کوئی
منہ پہ ملتے ہیں سہولت سے وہ سر کی ٹانک

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

گنجا وضو میں منہ کو دھوئے کہاں تلک
وہ کون سا مقام ہے جس کا مسح کرے
اس اہم مسئلے پہ ذرا لب کشائیے
اتنا سا ہے سوال مرا اہل علم سے
حد سر کی کس مقام سے ہوگی شروع اور
ماتھے کی ختم ہوگی کہاں حد بتائیے

خالد محمود

ٹوپی پہنے ہوئے ہر شخص کو گنجا نہ سمجھ
اس بہانے سے ہیں کچھ گنج چھپایا کرتے

عرفان قادر

اپنا ہی ہے قصور جو ٹھنڈی ہوئی ہے ٹنڈ
کیوں آپ کو حضور شکایت ہوا سے ہے

عرفان قادر

بیچ میں ہے صاف کھڈا سائیڈوں پر بال ہیں
دیکھ کر ایسا سراپا ہاتھ میں کھجلی ہوئی

سید فہیم الدین

میں بلاتا ہوں پر نہیں آتا
نامرادا ادھر نہیں آتا
جب بھی ہوتی ہے ہاتھ میں کھجلی
کوئی گنجا نظر نہیں آتا

سگار لکھنوی

ادراک سے عاری ہے تو بالوں سے بھی خالی
سر یوں بھی چھپاتے نہیں دستار کے نیچے

سرفراز شاہد

کیسی سر چڑھ کے آرہی ہے ہوا
سر سے وگ کو اڑا رہی ہے ہوا

نوید ظفر کیانی

شب زفاف جو دلہن نے چیخ ماری ہے
مرا خیال ہے دولہا نے وگ اُتاری ہے

خالد محمود

کمرے میں ہو رہیں تھیں کئی چہ مگوئیاں
حیرت زدہ تھے لوگ کہ ہے کیا پڑا ہوا
حرکت جو اس نے کی تو یہ سب پر کھلا۔ کہ تھا
بستر سے سر نکال کے گنجا پڑا ہوا

خالد محمود

گنج پن کے علاج

کیا ضروری ہے کہ گنجے کو دوائیں دیتے جائیں
صاحبانِ گنج اس پر غور فرمائیں گے کیا
کتنے دن گنجوں کے سر پر ہاتھ رکھے گا طبیب
گنج کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا

امیر الاسلام ہاشمی

ہے کمال حضرت ڈاکٹر ہیں تمہارے سر پہ طویل تر
کبھی تم بھی گنجے تھے سر بہ سر ہمیں اب دکھاتے ہو بال کیا

سید فہیم الدین

ایک گنجے کو سنا ہم نے یہاں کہتے ہوئے
میں نہ مرجاؤں دوائی کا اثر ہونے تک
چار برسوں میں اُگے چار مرے سر پہ بال
"کون جیتا ہے مری زُلف کے سر ہونے تک"

ڈاکٹر مظہر عباس

سو کوششوں سے آئے ہیں چندیا پہ چند بال
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

احمد علوی

بتائیں کیا تمہیں کیا کیا جتن کیے ہم نے
گئی ہے اپنی یہ ہیئت کذائی مشکل سے
ہمارا سر تھا کہ چٹیل پہاڑ تھا جس پر
یہ گھاس دوستو ہم نے لگائی مشکل سے
مٹی ہے گنج ہماری "بہ فیضِ ٹرانسپلانٹ"
یہ فصل ہم نے ہے سر پر اُگائی مشکل سے

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

وگ ساز گر ملے تو میں پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ سارے "گنجِ گراں مایہ" کیا کیے

شوکت جمال

مصنوعی بالوں کا چھپّر کافی بھاری ہوتا ہے
اس کی زلفوں نے ہل ہل کر رخساروں کو مار دیا

خالد عرفان

لگائی وگ کبھی کروا لیا ٹرانسپلانٹ
بڑے جتن کیے جاتے ہیں بال و پر کے لئے

عرفان قادر

غلط مشورے

بال جو بچ گئے ہیں کچھ سر پر
ناز اب ان کے تو اٹھا گنجے
بال اُگتے نہیں دواؤں سے
سر میں اب ڈال یوریا گنجے

ممتاز راشد

تیل ڈالا ہے بال بڑھنے کا
فارغ البال ہوگئے ہیں ہم

احمد علوی

نہ اس تیل کی دھار اور مار پوچھو
کی مالش تو کیا بے مثال آگئے ہیں
مرا سر ابھی تک ہے گنجے کا گنجا
ہتھیلی پہ ہفتے میں بال آگئے ہیں

محمد عارف

تم نے بالوں کی طوالت کے لئے جو دی تھی
باعث ٹنڈ وہ کمبخت دوائی ہوئی ہے

ادریس قریشی

گنجے پن کا نظمیہ بیانیہ

گنجا

جب زلفِ پریشان کو سلجھاتا ہے گنجا
دل کتنی حسیناؤں کا دھڑکاتا ہے گنجا
اک بار تو ہر چیز کی رک جاتی ہیں سانسیں
کنگھا جو کبھی ہاتھ میں لہراتا ہے گنجا
ڈشنگ کوئی ہم سا ہو تو پھر سامنے آئے
آئینے میں خود سے یہی فرماتا ہے گنجا
ٹوپی جو اتارے تو نکل آتا ہے ہلمٹ
حیران و پریشان کیے جاتا ہے گنجا
جینگن کبھی لگتا ہے تو ٹینڈا کسی لمحے
ہر روپ میں ڈیسنٹ نظر آتا ہے گنجا
اس پار کی لٹ کھینچ کے لاتا ہے جو اس پار
صحرا پہ کوئی پُل سا بنا جاتا ہے گنجا
جوؤں کے تو جل جاتے ہیں فوراً وہاں پاؤں
جب ٹنڈ لئے دھوپ میں آجاتا ہے گنجا
جاتے ہوئے آتا ہوا دیتا ہے دکھائی
ہر سمت سے اِک جیسا نظر آتا ہے گنجا

سر تیل سے چمکاتا ہے جب مار کے تا کی
ایسے میں تو سورج کو بھی چندھیاتا ہے گنجا
اک بار تو ہو جاتا ہے نائی بھی پریشاں
جھالر اسے گردن کی جو پکڑاتا ہے گنجا

خالد محمود

گنج نامہ

ہاتھ میں کنگھی پکڑے عرصہ بیت گیا
سر کی کھیتی اجڑے عرصہ بیت گیا
آئینہ دیکھیں تو غصہ آتا ہے
سر سے ٹوپی اترے عرصہ بیت گیا
نائی بھی ہم کو دیکھتا ہے اب حسرت سے
اس سے بال منڈائے عرصہ بیت گیا
بال کہاں بس چمک ہی بڑھتی جاتی ہے
تیل اور شیمپو ملتے عرصہ بیت گیا
رشتہ مانگیں تو ''نشتہ'' ہی سنتے ہیں
خواب میں ڈھولک بجتے عرصہ بیت گیا
ہم نے شوق سے کب یہ سر منڈوایا تھا
اولے پڑتے پڑتے عرصہ بیت گیا
چپت لگا کر یار یہ اکثر کہتے ہیں
ایسا ماڈل دیکھے عرصہ بیت گیا
سنا تھا گنجے قسمت والے ہوتے ہیں
اور سنتے ہی سنتے عرصہ بیت گیا

ڈاکٹر بدر منیر

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی اسلام آباد سے تعلق رکھتے ہیں۔ طبی حوالے سے مزاحیہ شاعری انہیں کی اختراع ہے۔ ان کے طنز و مزاح پر مبنی نصف درجن سے زیادہ شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ طنز و مزاح نگاری کے ساتھ ساتھ نہایت شستہ و شگفتہ شاعری کے مرتکب بھی ہوتے چلے آ رہے ہیں۔ ''ارمغانِ ابتسام'' کے اولین کرمفرماؤں میں شامل ہیں۔

نوید ظفر کیانی

نقصان پہنچانا

بسا اوقات ہم شعوری یا غیر شعوری طور پر انسانی روّیوں کے درمیان ایک واضح خط کھینچ دیتے ہیں اور مبینہ طور پر اسے دو مختلف حصوں میں بانٹ دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اپنے ادراک کے ہاتھوں میں لٹھ تھما کر اسے چوکیدارے پر بٹھا دیتے ہیں کہ اِدھر کا بندہ اُدھر نہ اُدھر کا بندہ اِدھر۔ گویا کسی شخص کے بارے میں جو فیصلہ ہماری تفہیم نے دے دیا، وہی سپریم کورٹ کا فیصلہ ٹھہرا، اب اپیل نہتا۔

دیسی فلم بینی نے بھی کرداروں کے اس واضح فرق کو مزید جلی کر دیا ہے۔ ہم سمجھنے لگ گئے ہیں کہ ہمارے اِرد گرد جو افراد چل پھر رہے ہیں، وہ انہیں دو درجوں میں سے کسی ایک سے تعلق رکھتے ہیں۔ یا تو وہ ہیرو ہیں یا پھر ولن۔ ایک ہیرو کبھی ولن جیسا گھٹیا اندازِ فکر نہیں اپنا سکتا۔ اسی طرح کسی ولن سے بھولے سے بھی نیکی کا کام سرزد نہیں ہو سکتا۔

انسانی روّیے اِس قدر عمومی بھی نہیں ہوتے کہ اس کے بارے میں اس قدر واضح فیصلہ جڑ دیا جائے۔ کسی خاص موقع پر کوئی فرد کس انداز میں سوچتا ہے اور کس ردِ عمل کا اظہار کرتا ہے، اِس کے بارے میں حتمی اندازہ لگانا کسی حقیقت پسند اور عقلیت پر مبنی سوچ کے بس کی بات نہیں لیکن اس واشگاف حقیقت اور بارہا کے تجربے کے باوجود ہم اپنے ذہن میں کسی بھی فرد کے اندازِ فکر کے بارے میں ایک تصویر سی بنا لیتے ہیں جو کبھی متاثر نہیں ہوتی۔ ہماری آرا اگر بدلتی بھی ہے تو اسی نظریے کے گرد گھمن گھیری کیے رکھتی ہے۔ مثلاً بچپن یا لڑکپن میں فلم بینی اور رسائل کے افسانوں سے ہم نے ''ظالم سماج'' کا ایک حتمی خاکہ اپنے ذہن میں بنا لیا تھا۔

اس خاکے کے مطابق ظالم سماج ایک ایسی ”ظالم اور قاتل بلا“ کا نام ہے جس کا کام ہی ہر رنگ میں بھنگ ڈالنا ہے۔ اس نے ہاتھوں میں ایک خنجر اُٹھا رکھا ہے جس سے خون ٹپک رہا ہے۔ وہ ہر اُس جگہ پر وار کرنا اپنا فرضِ اوّلین سمجھتا ہے جہاں کوئی اچھا کام ہو رہا ہوتا ہے یا پھر یوں کہہ لیجیے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ اس کام کو ضرور ہونا چاہیے۔ اس قسم کے کاموں میں ”دو دلوں کا ملنا“ سرِ فہرست ہے لیکن یہ خبیث، پاجی، قاتل، ظالم سماج ایسا ہونے نہیں دیتا۔ ہر اُس موڑ پر للکارتا ہوا پہنچ جاتا ہے جہاں سے کہانی سب کو ہنسی خوشی زندگی بسر کرنے کا موقع فراہم کرنے والی ہوتی ہے۔ یہ نہ صرف اس سلسلے کو اپنے خونی خنجر سے دولخت کر کے رکھ دیتا ہے بلکہ کچھ ایسی گڑبڑ بھی کر جاتا ہے کہ کہانی کے دُکھی کردار ہی بددعائیں نہیں دیتے بلکہ اس کہانی کو دیکھنے اور پڑھنے والے بھی اسے من من کی گالیاں دینے لگتے ہیں۔

شعور کے ارتقاء اور انسانی رویوں کی حقیقت پسندانہ تقسیم نے جب بعدازاں ہمیں بتایا کہ یہ جو ظالم سماج نام کی مخلوق ہے، اس کے اجزائے ترکیبی میں ہم آپ، سب لوگ شامل ہیں۔ یہ ہمارے معاشرے کے مجموعی روّیوں کا نام ہے۔ پتہ نہیں ”سماج“ کو لغت نے ہم سے کیسے منسوب کر دیا۔ ہم تو اس ظالم سماج کو کبھی اپنا نہ سکے، ہمیشہ گالیاں ہی دی ہیں، تو کیا اپنے آپ کو گالیاں دیتے رہے ہیں؟ نان سینس!

فطری طور پر میں ایک اچھا بچہ ہوں۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میرا عمومی روّیہ ہمیشہ مثبت رہا ہے۔ میری حمایت ہر نیکی کے کام کو حاصل رہی ہے اور ہر بدی پر سگِ آوارہ کی طرح بھونکنا میں اپنا فرضِ منصبی سمجھتا رہا ہوں لیکن اس کے باوجود یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انسانی روّیہ اس قدر جبری طور پر منقسم نہیں ہے جتنا سمجھا جاتا ہے۔ کبھی کبھار یہ صراطِ مستقیم پر چلتے چلتے ٹھوکر بھی کھا جاتا ہے۔ کبھی کبھار مجھ جیسا اچھا بچہ بھی اُس لطیفے والا بچہ بن جاتا ہے جو اُچک اُچک کر ایک گھر کی گھنٹی تک پہنچنے کی کوشش کر رہا ہوتا ہے۔ قریب سے گزرتے ہوئے ایک نیک اور رحم دل بزرگ نے دیکھا تو اس کی مدد کے خیال سے آگے بڑھا اور اُس کی جگہ گھنٹی بجا دی۔ بچے نے انکل کا شکریہ ادا کیا اور فرمایا ”اب بھاگ چلیے۔“

عین اس بچے کی طرح میں نیکی کا فرشتہ ہونے کے باوجود کبھی کبھار ایسی کارستانیاں بھی دکھا جاتا ہوں جس سے کسی نہ کسی کو کوئی نہ کوئی نقصان ضرور پہنچتا ہے لیکن میں اسے اپنی ذات کا زاویۂ معکوس سمجھتا ہوں اور اپنی نظروں میں اپنا اچھا بچہ ہونے کا تاثر زائل نہیں ہونے دیتا۔ کوئی شرارت گناہ کا کانٹا بن کر زندگی کی خلش نہیں رہ پاتی، پتہ نہیں کیوں؟

آج صبح کی بات ہے، میں نے اپنے شریر طرزِ عمل سے دو خواتین کو نقصان پہنچایا۔ ایسی خواتین کو جنہیں میں جانتا بھی نہیں تھا۔ اُنہیں نقصان پہنچا کر بھی مجھے کوئی احساسِ گناہ یا ندامت نہیں ہوئی بلکہ میں اب بھی اپنی اس حرکت کا حظ اُٹھا رہا ہوں۔ یہی نہیں، کئی احباب سے اس کا تذکرہ بھی لون مرچ لگا کر کر چکا ہوں، گویا

اپنے گناہ کا اُنہیں بھی گواہ بنا چکا ہوں۔

ہوا یوں کہ آج صبح میں اپنی گیارہ نمبر والی گاڑی پر دفتر جا رہا تھا۔ گیارہ نمبر والی گاڑی سے آپ دھوکہ مت کھائیے۔ یہ یہاں کی کسی پبلک ٹرانسپورٹ کا رُوٹ نمبر نہیں۔ یہ وہ والی گاڑی ہے جو ہر کہیں چلتی ہے یونی سب کی اپنی ذاتی دو ٹانگیں۔ میری رہائش آئی نائن، اسلام آباد میں ہے اور دفتر سیٹلائٹ ٹاؤن، راولپنڈی میں واقع ہے۔ یہی کوئی ڈیڑھ دو میل کا فاصلہ ہے جو میں پیدل طے کرتا ہوں۔ دفتر جاتا بھی پیدل ہوں اور پھر واپسی بھی اِسی ترکیب سے ہوتی ہے، گویا دوطرفہ ٹریفک اسی گیارہ نمبر والی گاڑی کی مرہونِ منت ہے۔ سفر کے دوران ایک راستے کے اختتام پر ایک موڑ ایسا بھی آتا ہے، جس سے اگلے راستے سے دو مختلف راستے ملتے ہیں۔ ایک تو یہی موڑ والا راستہ اور دوسرا اس موڑ سے قبل ایک پتلی سی گلی ہے۔ آگے جا کر موڑ والا راستہ اور اس پتلی گلی کا راستہ ایک ہی راستے پر جا پہنچتا ہے۔ آج صبح جب میں اُس موڑ کی طرف جا رہا تھا تو مجھ سے آگے دو خواتین بھی خراماں خراماں چلی جا رہی تھیں۔ میں اُن سے اِس قدر قریب تھا کہ مسلسل اُن کی گفتگو یعنی تیری میری بُرائیوں میں شریکِ راز بنتا جا رہا تھا، باوجودیکہ دونوں میری قریبی موجودگی سے کماحقہ آگاہ تھیں، لیکن کسے پرواہ تھی۔ بعض خواتین کی فطرت ہے کہ جب وہ گل افشانیوں کی موج میں ہوں تو پھر دنیا و مافیہا سے بیگانہ ہو جاتی ہیں۔ یہ خواتین بھی اِسی قبیلے سے تعلق رکھتی تھیں۔ جب ہم تینوں موڑ سے قبل اُس پتلی گلی کے قریب پہنچے تو اُن دونوں خواتین میں سے ایک خاتون نے کہا کہ اس پتلی گلی سے نکل چلتے ہیں۔ دوسری نے مخالفت کی اور کہا کہ موڑ والی گلی سے چلتے ہیں، یہ گلی بہت پتلی ہے۔ پہلی نے کہا کہ اب یہ اِتنی بھی تنگ ظرف نہیں ہے کہ ہم دونوں کو برداشت نہ کر سکے، علاوہ ازیں اس پتلی گلی کی یہ خاصیت بھی ہے کہ یہ شارٹ کٹ بھی ہے۔ یعنی ہمیں چلنا بھی کم پڑے گا۔ مختصر بحث کے بعد دونوں اُس گلی میں مُڑ گئیں۔ عین اُسی وقت شیطان نے میرے کانوں میں سرگوشی کی اور صلاح دی کہ ان عورتوں کو اس تساہل کا مزہ چکھانا چاہیے۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ سفر میں بھی شارٹ کٹ ڈھونڈا جائے، چاہے وہ کتنا ہی نامعقول کیوں نہ ہو۔ اور ایسی صورت میں تو اور بھی قابلِ مذمت ہے جبکہ آپ ایک طویل عرصہ سے اِسی نام نہاد لمبے راستے کو اختیار کیے ہوئے ہیں۔ میں نے لمبے لمبے ڈگ بھرنے شروع کر دیے اور تقریباً بھاگم بھاگ موڑ مڑ کر اُس گلی تک پہنچا جس میں اُن دو خواتین نے پتلی گلی میں سے ہو کر آنا تھا۔ ظاہر ہے، وہ ابھی تک نہیں پہنچی تھیں۔ اُس راستے پر آ کر میں دوبارہ اپنی معمول کی سست روی سے چلنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد دونوں خواتین اُس پتلی گلی میں سے نمودار ہوئیں۔ میں اُن سے خاصا آگے نکل چکا تھا۔ اُن کی گفتگو تو ٹھیک طرح نہیں سُن پا رہا تھا لیکن جس طرح مجھے خود سے آگے دیکھ کر وہ چونکی تھیں اور اس ضمن میں ایک دوسرے سے ہاتھ لہرا لہرا کر باتیں کر رہی تھیں، اُس سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ میں اُنہیں یہ احساس دلانے میں کامیاب رہا ہوں کہ وہ پتلی گلی کا راستہ اختیار کر کے نقصان میں رہی ہیں۔ اگر وہ شارٹ کٹ ہوتا تو بھلا میں اُن سے پہلے اور اس قدر آگے اُس راستے پر کیسے پہنچ سکتا تھا۔ شیطان نے بھی میری پیٹھ ٹھونک کر کامیابی پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی تھی۔

میری ملازمت سے ریٹائرمنٹ کی عمر چند برسوں کی دوری پر ہے اور اس عمر میں جب بندہ اللہ اللہ کرتا ہے اور ہر قسم کی برائیوں پر لاحول پڑھتا ہے، مجھ میں اس قدر شر پسندی کا ذخیرہ ہونا خاصے اچھنبے کی بات لگتی ہے لیکن پھر بھی میں اس ضمن میں انکساری کا اظہار کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ مجھ میں اس قدر ٹیلنٹ ہرگز ہرگز موجود نہیں کہ میں از خود اس قدر برجستہ شر انگیزی کا اختراع کر سکوں۔ میں قطعاً اس داد کا حقدار نہیں۔ اس کا سارا کریڈٹ میں اپنے جینئس لنگوٹیے مدثر کو دیتا ہوں جس کی صلاحیتیں اس قسم کے کارِ خیر و شر میں عدیم المثال ہیں۔ میں اُس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔ آج جو ایک باریش سے صاحب اپنے جیسے دوسرے بزرگوں کی معیت میں اعلیٰ اقدار کا درس دیتے نہیں تھکتے، یہ سب اُنہیں کا دیا ہوا صدقہ ہے جو اب صدقۂ جاریہ بن چکا ہے۔ اس میدان میں میں بے چون و چرا اُن کو اپنا استاد تسلیم کرتا ہوں۔

یہ اُس زمانے کا تذکرہ ہے جب ہمارے ملک میں ایک عجوبہٗ

عالم کا جن نمودار ہوا تھا۔ یہ کمپیوٹر نامی شے تھی جس کے بارے میں دوسروں کی طرح مجھے بھی کوئی خاص آگاہی نہ تھی کہ اسے کھایا جاتا ہے یا لگایا جاتا ہے۔ ہم دونوں یارِ غار لڑکپن کی حدود پار کر رہے تھے۔ مستقبل میں کمپیوٹر کے بڑھتے ہوئے سکوپ کو سونگھ کر مدثر نے ایک کمپیوٹر سینٹر میں داخلہ لے لیا تھا، جہاں آپریٹنگ سسٹم ''ڈاس'' پر کمپیوٹر کی مبادیات کے ساتھ ساتھ چند ضروری کورسز بھی کرائے جاتے تھے مثلاً لوٹس، ورڈ سٹار، کوبول وغیرہ۔ اُس زمانے میں علی بابا کے اس غار کو کھولنے کے لئے انہیں منتروں پر تکیہ کیا جاتا تھا۔ آئی ٹی یا انٹرنیٹ کا دور تو بہت بعد کی بات ہے۔ مدثر مجھ سے کمپیوٹر کے بارے میں اس طرح گفتگو کرتا تھا جیسے طلسم ہوشربا چھیڑ بیٹھا ہو۔ غیر شعوری طور پر میں بھی کمپیوٹر کے متاثرین میں شامل ہو گیا لیکن ابھی ایک آدھ آنچ کی کسر باقی تھی جس کی وجہ سے میں نے تا حال سینٹر میں داخلہ نہیں لیا تھا۔ ایک دن یونہی شوق چرایا کہ کمپیوٹر کا دیدار کیا جائے اور کچھ دیر کے لئے اس کی رنگینیوں سے فلرٹ کیا جائے۔ (میں نے رنگینیوں کا لفظ یونہی زیبِ داستان کے طور پر استعمال کیا ہے ورنہ اُس زمانے کا مانیٹر ایک تو بارہ چودہ انچ سے زیادہ کا نہیں ہوا کرتا تھا، جو آج کے دور میں قطعاً ''بے اوقاتا'' ہے، دوسرا یہ مکمل طور پر بلیک اینڈ وائٹ تھا۔ آسان الفاظ میں اسے ''کلموہا'' کہہ سکتے ہیں۔ کمپیوٹر بھی ابھی انٹرنیٹ کے پرستان میں داخل نہیں ہوا تھا۔)

کمپیوٹر سینٹر کا کاروبار اُس زمانے میں جدید ترین تعلیمی نظام کا ایک حصہ سمجھا جاتا تھا اور خاصا نفع بخش کاروبار تھا۔ شہر بھر میں جابجا کمپیوٹر سینٹرز اُگ آئے تھے۔ بہت سے کمپیوٹر سینٹر تو محض ایک کمپیوٹر سسٹم پر مشتمل ہوا کرتے تھے لیکن پھر بھی اُس کا پرنسپل فخر و مباہات سے یوں پھولا ہوا ہوتا تھا جیسے مائیکروسافٹ کا شراکت دار ہو۔ کورسز کی فیس بھی نامعقول حد تک زیادہ ہوا کرتی تھی۔

میں مدثر کی معیت میں کمپیوٹر سینٹر پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بڑا سا ہال ہے جس میں ایک طرف کی دیوار کے ساتھ ایک لمبے سے ٹیبل پر چار عدد کمپیوٹر سسٹم پڑے ہوئے تھے۔ سسٹم کے ٹیبل کے ساتھ ساتھ ایک بینچ دھرا ہوا تھا جو اُس ٹیبل جتنا لمبا تھا۔ ہال کے مخالف سمت والی دیوار کے ساتھ اسی قدر لمبا بینچ نصب کیا گیا تھا۔ غالباً اسے انتظار گاہ کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ مدثر نے مجھے اپنے ساتھ ہی بینچ پر بٹھا لیا اور کمپیوٹر آن کرنے لگا۔ کمپیوٹر ابھی بوٹنگ کے مرحلے میں تھا یعنی ڈاس ابھی جوتے ہی پہن رہا تھا کہ ایک صاحب جو حلیے سے وہاں کے خدمتگار لگتے تھے، مجھ سے آکر پوچھنے لگے ''آپ گیسٹ ہیں؟''

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''گیسٹ کو یہاں بیٹھنا الاؤ نہیں ہے، آپ اس پچھلے والے

کرکٹ کا گول

مشرقی عورت جہاں اپنی حرماں نصیبی پہ ماتم کناں اور زندگی کے کارزار میں مردوں کی بالادستی پر نالاں اور دل گرفتہ ہے، وہاں فیشن کے میدان میں مردوں سے کوسوں آگے داد و دہش دے رہی ہے۔ انہوں نے بعض شوق صرف اس جنون میں پال رکھے ہیں کہ کہیں مردوں سے پیچھے نہ رہ جائیں۔ کرکٹ کو لے لیجیے، گلی ڈنڈے کی یہ اولاد کھیل کی صورت میں جب مردوں میں مقبول ہوا تو عورتوں نے پیچھے رہنا گوارا نہ کیا، حالانکہ ہیئت اور ہیبت کے اعتبار سے یہ خالصتاً مردانہ بلکہ وحشیانہ کھیل ہے۔ ایک کمر خمیدہ 'مظلوم شخص' جو حالتِ رکوع میں پہلے ہی تعظیم بجا لایا ہوتا ہے، اس پر ایک ظالم اور مخبوط الحواس آدمی پے در پے اور بلاجواز سنگ باری کیے جاتا ہے۔ عام حالت میں شقاوت بھرے ایسے واقعات خواتین کی نازک مزاجی سے مطلق لگا نہیں کھاتے لیکن کرکٹ میچ میں عورتیں بھی فقط فیشن میں ''اِن'' رہنے کی خاطر چار پانچ روز چلہ کشی میں مبتلا ہوتی ہیں۔ اس چلہ کشی میں فاقہ کشی بھی شامل ہوتی ہے کہ خاتون خانہ کچن کا دورہ صرف اس لیے مؤخر کیے رکھتی ہیں کہ اس دوران کوئی ''چوکا'' یا ''چھکا'' قضا نہ ہو جائے۔ دوسری جانب کرکٹ کے بارے میں خواتین کی معلومات عامہ کا یہ عالم ہے کہ ادھر اپنے کسی باؤلر کی کسی ایمان افروز گیند سے مخالف ٹیم کی وکٹ اُڑی، اُدھر خواتین نے یک زبان نعرہ بلند کیا ''گول!''

جے ایم بیان از ملک بشیر مراد

بینچ پر ہو جائیں۔" اُس نے حتمی لہجے میں کہا۔

مدثر نے مداخلت کی "یہ میرے ساتھ ہیں۔"

وہ بولا "صاحب کہہ رہے ہیں کہ یہ یہاں نہیں بیٹھ سکتے۔"

مدثر نے دُور شیشے کے کمرے میں محصور شخص کو دیکھا اور منہ ہی منہ میں اُسے ناقابلِ شناخت خطاب سے نوازا۔ میں چپ چاپ اُٹھ کر پچھلے بینچ پر چلا گیا۔ ظاہر ہے کہ میں سیاستدان تو تھا نہیں کہ گالی گلوچ پر اُتر آتا اور وہ کوئی مقننہ کا مقدس ایوان تو تھا نہیں کہ جس کے قوائد وضوابط توڑنا قومی فریضہ ہوتا۔ مدثر کچھ دیر بعد اپنی جگہ سے اُٹھ کر میرے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ اُس کی آنکھیں کسی خیال سے چمک رہی تھیں۔

"سالا، ٹکے کا نواب، اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے۔"

میں نے اُس کے اس اظہارِ یکجہتی اُس کو ممنون نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا "چھوڑو یار، تم فارغ ہولو تو چلتے ہیں۔"

وہ بولا "لیکن اس چپڑ قناتی کو اس خباثت کی سزا تو ملنی چاہیئے۔"

"بھلا ہم کیا کر سکتے ہیں؟" میں نے کندھے اچکائے۔

"کیا کر سکتے ہیں؟ بہت کچھ کر سکتے ہیں، اس خبیث کا خاصا نقصان کر سکتے ہیں۔"

مدثر کے بیان کی روشنی میں میں نے ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں ہال کا جائزہ لیا کہ دو نحیف و نزار جانوں سے اُن مسٹنڈوں کا کیا کیا نقصان پہنچ سکتا تھا۔ وہاں کمپیوٹر سسٹم تھے یا پھر فرنیچر کا سامان، یہی وہاں کی کل کائنات تھی۔ تو کیا ہم اُن کمپیوٹر سسٹم کو اُٹھا اُٹھا کر پٹخنا شروع کر دیتے یا فرنیچر کی توڑ پھوڑ شروع کر دیتے؟ یہ ناممکن تھا۔ اُن ظالموں نے اس عمل کے انتہائی ابتدائی پیشقدمی کے مرحلے میں ہی ہم دونوں کا جرمنی جاپان ایک کر دینا تھا۔

"بھلا ہم کیا کر سکتے ہیں ان کا؟" میں نے دوبارہ بے بسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا "کیا ان کمپیوٹر سسٹم کو۔۔۔۔"

"ارے نہیں!" مدثر نے میری بات اچک لی "ہم اس خبیث کو نفسیاتی مار دے سکتے ہیں۔"

"بھلا وہ کیسے؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

مدثر نے جب "نقصان پہنچانے" والے منصوبے کے خدو خال واضح کیے تو میں اُس کی جودتِ شیطانی پر عش عش کر اُٹھا۔ واقعی، یہ تو بڑا نقصان ہو جاتا اُس کا۔ کئی دنوں تک نفسیاتی خلش کا شکار رہنا تھا اُس خبیث نے۔

اُس کمپیوٹر سینٹر کے مالک کا نام پتہ نہیں کیا تھا لیکن مدثر نے اِتنے تواتر سے اُس کے لئے "خبیث" کا صیغہ استعمال کیا تھا کہ میں بھی اُسے اسی لقب میں سوچ رہا تھا۔ آپ بھی گوارہ فرما لیجئے۔

مدثر کی ہدایت کے مطابق میں اپنی جگہ سے اُٹھا اور سیدھا اُس شیشے والے جا گھسا جہاں وہ خبیث، ایک لمبی سی میز کے پیچھے اپنی خودساختہ "عزت" کو ٹیکے بیٹھا تھا۔ میں جاتے ہی اُس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ بڑے لوگوں کی طرح دُعا سلام کا تکلف بھی گوارہ نہیں کیا۔ اُس نے استفہامیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

"آپ نے مجھے وہاں سے اُٹھا کر اچھا نہیں کیا۔" میں نے نہایت نرم لہجے میں کہا۔

"یہ یہاں کا رُول ہے، آپ انرول ہوئے بغیر وہاں نہیں بیٹھ سکتے۔ ہاں البتہ گیسٹ والے ائریے کے سلسلے میں کوئی ممانیت نہیں، آپ وہاں بیٹھ سکتے ہیں۔" اُس نے افسرانہ شان سے کہا۔

"دراصل میں یہاں ایک مقصد کے تحت آیا تھا۔ میں جس کالج میں پڑھتا ہوں وہاں ہم بیس پچیس لڑکوں کا ایک گروپ ہے جو کسی کمپیوٹر سینٹر سے "کوبول لینگوئج" کا کورس کرنا چاہتا ہے۔ اُنہوں نے اسی سلسلے میں مجھے یہاں بھیجا تھا لیکن یہاں کے ماحول نے مجھے بددل کر دیا ہے۔ یہاں تو سوشلسٹ ملکوں جیسی گھٹن ہے، اب مجھے کوئی دوسرا کمپیوٹر سینٹر دیکھنا ہوگا۔"

"آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا!" وہ خبیث یکدم اُٹھ کھڑا ہوا۔ ہزاروں نوٹوں کی چمک اُس کے بے دید دیدوں میں لہرا گئی "آپ کو مجھ سے پہلے ہی مل لینا چاہیئے تھا۔"

"لیکن اب کوئی فائدہ نہیں۔" میں نے اُٹھتے ہوئے کہا "آپ اپنے رولز کو فالو کرتے رہیں، کم از کم میں اپنے دوستوں کو ایسی جگہ ہرگز ہرگز ریکمینڈ نہیں کروں گا جہاں کے لوگوں کو پتہ ہی نہ

ہو کہ کلائنٹس کو کیسے ٹریٹ کرنا ہوتا ہے۔"

"لیکن سر۔۔۔" اُس نے کچھ کہنا چاہا لیکن میں سنی ان سنی کرتا ہوا اُس کے شیشے والے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکلا اور اُس کمپیوٹر سینٹر سے نکلتا چلا گیا۔

آپ بخوبی تصور کر سکتے ہیں کہ میں نے اُسے کتنا بڑا نقصان پہنچایا تھا۔ اب یہ احساسِ زیاں سالہا سال تک اُس کی نیندیں اُڑاتا رہے گا کہ اِتنا بڑا بزنس اُس کے ایک بے معنی اور چھچھوری حرکت کی وجہ سے ہاتھوں سے جاتا رہا۔

لیکن ٹھہریے۔۔۔ کسی کو اس انداز سے نقصان پہنچانے کا آئیڈیا محض مدثر کی اپنی ذہنی اختراع کا نتیجہ نہیں تھا۔ اُس نے اس کا مرکزی خیال ایک اور فنکار سے مستعار لیا تھا۔ متذکرہ واقعے سے بھی پہلے ایک بھکاری نے ہمیں اس انوکھے احساسِ زیاں سے روشناس کرایا تھا۔ اُس دن سے پہلے کی شام کو حکومتِ وقت نے سالانہ بجٹ کا اعلان کیا تھا۔ ہماری سہ رُکنی کمیٹی (کمیٹیاں عموماً سہ رکنی ہی ہوتی ہیں) راشد کی کھلونوں والی دکان میں بیٹھی اُسی بجٹ کا تجزیہ کر رہی تھی۔ اُن دنوں ٹینچ بھاٹہ میں کھلونوں کا بزنس جمود کا شکار تھا۔ شائد بچوں پر حقیقت پسندی کا وائرس حملہ آور ہوا تھا یا والدین کی قوتِ خرید ہانپتے ہوئے ٹٹو کی طرح زبان لٹکائے ہوئے تھی۔ اکا دکا گاہک ہی وہاں کا چکر لگاتا تھا، وہ بھی دکاندار کی زبان میں اکثر "ڈاکٹر" ہی ہوا کرتا تھا، یعنی کھلونوں کے سلسلے میں اپنے تھیسس کے لئے محض ڈیٹا اکٹھا کرنے والا، لینا لوانا کچھ نہیں ہوتا تھا، چنانچہ ہم تینوں ماہرینِ معاشیات نہایت اطمینان سے بجٹ کے بارے میں اظہارِ خیال کر رہے تھے۔ ناگاہ وہاں سے ایک بھکاری کا گزر ہوا۔ ملکی معیشت پر ہماری پر مغز گفتگو نے اُس کے قدموں کو وہیں روک لیا۔ وہ دُکان میں داخل ہوا اور پوچھنے لگا کہ بجٹ کی وجہ سے کن کن اشیاء میں اضافہ ہوا ہے؟ مدثر نے اخبار پر نظر دوڑاتے ہوئے نہایت چابکدستی سے اُس کی معلومات میں خاطر خواہ اضافہ کیا۔

"سگریٹ کی قیمتیں بڑھی ہیں یا نہیں؟"

مدثر نے اُسے سگریٹ کے نرخوں میں اضافے کو فی صد میں منتقل کر کے بتایا۔

"والوں کا کیا حساب کتاب ہے؟" اُس نے پوچھا۔

مدثر نے اس سوال کا بھی جواب دے دیا۔

"اور کاسمیٹکس وغیرہ۔۔۔"

بھکاری کی بڑھتی ہوئی تفتیش نے مدثر کو زچ کر دیا۔ اُس نے تیز لہجے میں کہا "بابا جی، آپ نے کیا کرنا ہے یہ سب پوچھ کر۔۔۔"

"کاکے، میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ بجٹ کی وجہ سے میرا کتنا نقصان ہوا ہے؟"

"بابا جی، آپ کوئی بزنس مین ہیں؟" مدثر مرعوب ہو کر بولا۔ ہم سب نے ایسے بھکاریوں کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا جو قارون کے خزانے کے مالک ہوتے ہیں لیکن اپنا حلیہ اور کرتوت "گدایانہ" رکھتے ہیں۔

"یہ بات نہیں ہے کاکے، دراصل بجٹ سے ہر کوئی متاثر ہوتا ہے، چاہے وہ کوئی بھی ہو، حتیٰ کہ ہم بابا لوگ بھی۔۔۔ قیمتوں میں اضافے کے باعث لوگوں کی قوتِ خرید کم ہو جائے تو وہ بھیک دینے سے بھی ہاتھ کھینچ لیتا ہے۔ ہر بجٹ میں ہمارا خاطر خواہ نقصان ہوتا ہے، لگتا ہے اس بار بھی ایسا ہی ہے۔"

بھکاری یہ کہہ کر دکان کی دہلیز پار کر گیا اور ہم تینوں ماہرینِ معاشیات ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ گئے۔

نوید ظفر کیانی کا تعلق گوجر خان کے ایک قصبے "اسلام پورہ جبر" سے ہے تاہم مستقل سکونت اسلام آباد میں اختیار کئے ہوئے ہے۔ اُردو طنز و مزاح سے تعلق عمر کے ابتدائی اوائل سے رہا ہے۔ گزشتہ صدی کی ستر کی دہائی سے لکھ رہا ہے۔ پہلا مضمون بچوں کے رسالے "تعلیم و تربیت" کی زینت بنا۔ شاعری کا شغف بھی رکھتا ہے، اس ضمن میں بہت سی برقی کتابیں ویب سائٹ پر اپلوڈ کر چکا ہے۔ انگریزی کے فکاہی ادب کو مشرف بہ اُردو کرنے کے مشن پر گامزن ہے اور بہت سے چٹکلوں کو چمٹی سے پکڑ کر اُردو میں منتقل کر چکا ہے۔ برقی مجلّہ "ارمغانِ ابتسام" کا مدیر ہے۔

رکشہ

سرفراز شاہد

غیر رکشے میں یار رکشے میں
مشکلیں ہیں ہزار رکشے میں

تیری موجودگی سے جانِ من
آ گئی ہے بہار رکشے میں

آج کل ہو رہا ہے زوروں پر
حسن کا کاروبار رکشے میں

دے حسینوں کو کار سے تشبیہ
کر ہمارا شمار رکشے میں

آ رہا ہے مشاعرے کے لئے
شاعر نامدار رکشے میں

مجھ کو بے موت مار ڈالے گا
یہ ترا انتظار رکشے میں

ہے جہاں دو کا بیٹھنا مشکل
یہ بٹھاتے ہیں چار رکشے میں

شاہراہوں پہ روز ہوتے ہیں
حادثے بے شمار رکشے میں

کچھ نہ بگڑے ڈرائیور کا مگر
مارا جائے سوار رکشے میں

بن ہی جائے گا ایک دن آخر
شیخ جی کا مزار رکشے میں

لطف مزدا کے لے رہا ہے رقیب
اور ترا خاکسار رکشے میں

ہم تو رکشے میں ہیں سوار مگر
ہم پہ میٹر سوار رکشے میں

اب جو دھڑکا تو بیٹھ جائے گا
یہ دل بیقرار رکشے میں

آخرِ کار آ گیا ہم کو
موت کا اعتبار رکشے میں

میری توبہ ہے پھر نہ بیٹھوں گا
میرے پروردگار! رکشے میں

جس کا بیمہ نہیں ہوا شاہد
ہو نہ ہرگز سوار رکشے میں

مشورہ مفت لو!

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

شیخ نتھو ہو یا بی نصیبن کی ماں
جس کو دیکھو وہی ڈاکٹر ہے یہاں
ہر کسی کو وہ دیں نت نئے مشورے
کھول بیٹھے ہیں سب تجربے کی دکاں
کہتے ہیں بس یہی، فیس بے شک نہ دو
مشورہ مفت لو، مشورہ مفت لو

ہر پڑوسن تمہیں نسخہ لکھوائے گی
پیٹ میں درد ہو، سونف لے آئے گی
الٹیوں کے لئے اِک حکیمی دوا
اس کا شوہر جو لایا تھا، دے جائے گی
اور کہے گی کہ پھکی بیچ دودھ لو
مشورہ مفت لو، مشورہ مفت لو

کیا ہوا ہے جو گڈو کو کھانسی ہوئی
ہائے ہائے اسے کیسے سردی لگی
دیکھو ٹھنڈی غذا اس کو دینی نہیں
میں اکیلی نہیں سب ہیں کہتے یہی
پوست کے ڈوڈے لے کر ابھی جوش دو
مشورہ مفت لو، مشورہ مفت لو

بچہ کمزور ہے اس کو ہے سوکڑا
پیر صاحب سے تعویذ لاؤ ذرا
دودھ پتی اگر تم پلاؤ اسے
میں سمجھتی ہوں جلدی یہ ہو گا بڑا
شرط یہ ہے مگر دودھ ڈبے کا ہو
مشورہ مفت لو، مشورہ مفت لو

ٹیکے بچے کو ہرگز نہ لگوانا تم
ہے یہ معصوم بچہ نہ رلوانا تم
یہ حفاظت کے ٹیکے خطرناک ہیں
بے سبب ہی بخار اب نہ چڑھوانا تم
یہ نہ ہم کو گلے ،نے ہوا پولیو
مشورہ مفت لو، مشورہ مفت لو

زخم کیسے تمہیں ہائے یہ لگ گیا
صاف کرنا نہ پانی سے اس کو ذرا
پیپ پڑ جائے گی درد ہوگا بہت
راکھ بھر لو تو سب ٹھیک ہو جائے گا
آزمودہ ہے نسخہ مری مان لو
مشورہ مفت لو، مشورہ مفت لو

سر میں گر درد ہے، اسپرو کھایئے
سر کی مالش مگر خوب کروایئے
تیل سرسوں کا ہو یا ہو زیتون کا
اس کو قوت سے یوں سر پہ ملوایئے
چند منٹوں میں بس دردِ سر ختم ہو
مشورہ مفت لو، مشورہ مفت لو

ہیں بہاریں بہت کم، خزائیں بہت
گرم ہیں ڈاکٹر کی دوائیں بہت
آگ لگتی ہے سینے میں کھا کر انہیں
ہو چکی اب مری جاں جفائیں بہت
کوئی ٹھنڈی دوا تم حکیموں کی لو
مشورہ مفت لو، مشورہ مفت لو

مستند ہیں حوالے بہت دیکھنا
ہر دوائی کے پیچھے ہے راز اک نیا
نسخے سب ہیں یہاں آزمائے ہوئے
اب تلک تو نہیں کوئی ان سے مرا
موت برحق ہے اس سے کبھی مت ڈرو
مشورہ مفت لو، مشورہ مفت لو

هند وپاک جھڑپوں کے تناظر میں جب پاک فضائیہ نے جوابی حملے میں کشمیر میں ہندوستان کے دو طیارے مار گرائے۔

آپ کا شکریہ

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

لفظ بنتے ہیں، کرتے نہیں آنکھ نم، آپ کا شکریہ!
جو قلم سے نہیں کرتے سر کو قلم، آپ کا شکریہ!

سوتے تھے گھر میں ہم، دفعتاً ایک دم کودے وہ کر کے دھم
شور اتنا ہوا جاگے سارے بہم، آپ کا شکریہ!

بم چلائیں نہیں پاک اور ہند میں، کہتی دنیا تھی یہ
آپ کے بس تعلق میں ہو زیروبم، آپ کا شکریہ!

دین و ایمان سب کے سلامت رہیں، تا قیامت رہیں
رکھیں اپنا دھرم، ہوں نہ یوں ہٹ دھرم، آپ کا شکریہ!

برسٹ مت ماریے، برسٹ مت ماریے، برسٹ ہو جائیں گے
کیجئے ٹائیروں میں ہوا تھوڑی کم، آپ کا شکریہ!

جنگ کہنا ہے آسان، کرنا نہیں، ایسے مرنا نہیں
آپ کا ہی نہ ہو جائے کریا کرم، آپ کا شکریہ!

افطار میں

چھوڑ کر ساری نمازیں کھو گئے افطار میں
لوگ سب کھا کھا کے پاگل ہو گئے افطار میں

ہو گیا روزہ ہمارا اس طرح یارو ادا
ہم نہیں جاگے سحر میں سو گئے افطار میں

کھا کے تیزی سے نمازی سوئے مسجد چل دیے
اور ہم دستر پہ تنہا ہو گئے افطار میں

اس قدر افطار کی دعوت پہ تھا جمِ غفیر
مومنوں کی بھیڑ میں ہم کھو گئے افطار میں

چیل کی مانند لپکے ہم پکوڑوں کی طرف
ختم جب سارے سموسے ہو گئے افطار میں

دوستوں نے ڈٹ کے کھایا اور کھا کر چل دیے
اچھے خاصے اپنے پیسے تو گئے افطار میں

بن بلائے ہم گئے ہر دعوتِ افطار پر
بیج بے شرمی کے شانہ بو گئے افطار میں

اقبال شانہؔ

اقبال شانہؔ

کرادیں شہر میں اعلان میں روزے سے ہوں بھائی
ہے سارا شہر کیوں حیران میں روزے سے ہوں بھائی

مرے چہرے کی زردی گواہی صاف دیتی ہے
سمجھتے ہیں سبھی انسان میں روزے سے ہوں بھائی

اسی چھوٹے سے فقرے نے چھڑائی جان میری جب
میرے گھر آگئے مہمان، میں روزے سے ہوں بھائی

مجھے افطار میں جو میری مرضی ہو کھلا دینا
سحر ہوجائے گی آسان میں روزے سے ہوں بھائی

میں روزہ کھولنے کے بعد کہتا ہوں غزل یارو!
مکمل ہوگیا دیوان میں روزے سے ہوں بھائی

نہ جانے آج کل اکثر مرے خوابوں میں کیوں مجھ کو
نظر آتا ہے دسترخوان میں روزے سے ہوں بھائی

میں کیسے کام کر سکتا ہوں آفس میں بھلا شانہؔ
مری تکلیف میں ہے جان میں روزے سے ہوں بھائی

میں روزے سے ہوں نہیں

اقبال شانہ

ہے مجھ کو کولڈ کاف، میں روزے سے ہوں نہیں
بیمار ہوں، معاف، میں روزے سے ہوں نہیں

چھینکیں ہیں بے شمار ، لگاتار مستقل
سردی کا ہوں لحاف، میں روزے سے ہوں نہیں

ہے درد سر شدید، تماشہ بنا ہوا
وہ بھی ہے ہاف ہاف، میں روزے سے ہوں نہیں

اعضاء مرے بدن کے بہت لوز ہو گئے
اور ٹل گئی ہے ناف، میں روزے سے ہوں نہیں

روزہ نہیں ہے فرض ابھی مجھ نحیف پر
کیوں کر رہے ہو لاف، میں روزے سے ہوں نہیں

جو عذر پیش کرتے ہیں رمضان میں عجب
میں ان کے ہوں خلاف، میں روزے سے ہوں نہیں

بیمار تو ہے شانہ مگر جانتا ہے یہ
اللہ کرے معاف، میں روزے سے ہوں نہیں

رقیب کو بددعائیں

ڈاکٹر عزیز فیصل

قصور اور کا ہو، پر تری پٹائی ہو
خدا کرے تری سسرال میں ٹھکائی ہو

چھپا کے تیسری شادی ڈکارنے والے
نکاح خوان ترا نام ہی بدل ڈالے

حسینہ جب بھی محبت سے تجھ کو خط لکھے
خدا کرے وہ ترا ایڈریس غلط لکھے

اگر تو پمپ پہ پٹرول کے لیے آئے
تو کوئی بھولے سے گاڑی میں گیس بھر جائے

ترا بھی ہاتھ پھنسے اے ٹی ایم کے خانے میں
ہو اس پہ پرچہ بھی تیرے خلاف تھانے میں

تمھارے معدے کی ڈیمانڈ بے تحاشا بڑھے
تمھارے پیٹ پہ چربی بطور خاص چڑھے

نہ روز روز کے خرچوں سے تو سنبھل پائے
نہ تیرے گھر سے کبھی مستری نکل پائے

تری زبان پہ دانتوں سے روز کٹ آئے
خدا کرے ترے جبڑے کو زنگ لگ جائے

تری زنانی تجھے روز بددعائیں دے
وہ گھول کر تجھے چائے میں لال مرچیں دے

خدا کرے ترے پتے پہ پت نکل جائے
خدا کرے تری تلی میں موچ آ جائے

چلائے تم پہ ہر اک شخص جعلی نوٹ میاں
نہ درج ہو کسی حلقے میں تیرا ووٹ میاں

اگر کبھی تجھے تھوڑا بہت وصال ملے
تو اس حسینہ کا بھائی بھی اس کے "نال" ملے

تو کوئے یار کے نالے میں بار بار گرے
اور اپنی توند کے ہمراہ قسط وار گرے

دہی سے، دودھ سے، تم کو بڑی الرجی ہو
فضول کاموں میں ضائع تری انرجی ہو

تجھے ملے نہ کہیں جو اشد ضروری ہو
قمیض درزی تری جو سیئے، نہ پوری ہو

فراڈیوں میں ہمیشہ گھرے رہو صاحب
سفید جھوٹ لگے، سچ بھی گر کہو صاحب

تری ہر ایڑی کو محسوس ہو چھرے کی طرح
پرانے جوتے بھی کاٹیں تجھے نئے کی طرح

گلی کا پانی ترے گیٹ پر اکٹھا ہو
اور اتنا پانی، ہٹائے سے بھی نہ ہٹتا ہو

ہمیشہ بس میں کھڑے ہو کے تو کراچی جائے
لگے قطار میں جب تو، نہ تیری باری آئے

تو ڈسپرین بھی کھائے تو درد سر بڑھ جائے
تو فون آن کرے جونہی بیٹری سڑ جائے

چنئی شہر میں

اسانغنی مشتاق رفیقی

سخت گرمی سے ہیں سب بے حال چنئی شہر میں
کیا کریں وہ جن کا ہے سسرال چنئی شہر میں

شاعری لندن سے اور شاعر جہان آباد سے
چین سے آتے ہیں اب قوال چنئی شہر میں

مسندِ دانائی پر تشریف فرما ہیں گدھے
وہ بھی دن تھے، آئے تھے اقبالؔ چنئی شہر میں

اُن کی عیاری سے بچنا ہے بہت مشکل یہاں
ہر طرف بکھرے ہوئے ہیں جال چنئی شہر میں

اُس کے استقبال کی تم فکر کرنی چھوڑ دو
لے کے آئے گی صبا خود شال چنئی شہر میں

جب سے وہ ناقد بنے ہیں اُونگھتے لہجوں کے ساتھ
تب سے اُردو ہو گئی بد حال چنئی شہر میں

"اڈلی" اور "دوسے" سے ہٹ کر جب کھلاتے کچھ نہیں
کیوں بُلاتے ہو مجھے ہر سال چنئی شہر میں

مجھ سے یہ پوچھا، مرینا بیچ میں اک دوست نے
کھیلتے ہیں لوگ کیوں فٹ بال چنئی شہر میں

اس لئے مے خوار سارے پی رہے ہیں بے حساب
میکدوں کی کل سے ہے ہڑتال چنئی شہر میں

میں بڑا ہیرو ہوں کوئی اور نہ میں لیڈر کوئی
مس مجھے کرتی ہیں کیوں مس کال چنئی شہر میں

گورے، کالے، سانولے، نمکین چہروں سے سجے
کس قدر دلکش ہیں شاپ ان مال چنئی شہر میں

آپ بریانی کی دعوت اُن کو دے کر دیکھ لیں
کھانے آجائیں گے وہ بنگال چنئی شہر میں

نہ محبت ہے کسی میں نہ رواداری کہیں
ہو رہی ہے قدر سب پامال چنئی شہر میں

ساتھ یوں چلتے ہیں جیسے ساتھ میں چلتے نہیں
لوگ چلتے ہیں انوکھی چال چنئی شہر میں

دھول میں تہذیب تو کی، کھو رہے ہیں کیا کریں
ولّوور کے جاوداں اقوال چنئی شہر میں

پر یامٹ کی وہ ہماری منڈیاں، سب بک گئیں
اب کہاں بیچیں ہم اپنی کھال چنئی شہر میں

ہوں خفا جن سے رفیقؔ، وہ امیر شہر بھی
اب کریں گے میرا استقبال چنئی شہر میں

افطار نامہ

ذیشان فیصل شانؔ

چھوڑ دے روزہ نمازیں سب، مگر افطار کر
گر تجھے سحری نہیں کرنی نہ کر افطار کر

دن چڑھے انڈا پراٹھا ہو، چھپا کر ٹھونس لے
پھر دکھانے کے لئے بھی پیٹ بھر افطار کر

چھوڑنا روزے گناہوں کا سبب ہے اس لئے
چاہئے تھوڑی بہت نیکی اگر، افطار کر

گر نہیں ملتے تجھے باقی فضائل نہ سہی
پیٹ بھرنے کے لئے لیکن، سحر افطار کر

لال پیلے پھل، پکوڑے، چاٹ، شربت، رائتہ
نعمتیں ساری میسر ہیں نہ ڈر، افطار کر

دل اگر بھر جائے معدہ بھی ذرا خالی نہ ہو
پھیپھڑے، گردے، جگر تلی کو بھر، افطار کر

شرم آجائے تو فوراً یہ بہانہ سوچ لے
وسوسہ ہوتا ہے کچھ لمحوں کا شر، افطار کر

شانؔ گر روزہ نہ ہو پھر نعمتیں کس کام کی
اور روزہ ہے، تو ہے اچھی خبر، افطار کر

ہمیں بے تحاشہ بھگاتے ہیں کتے
بلم ایسے ہم کو بناتے ہیں کتے

گٹر میں کبھی خود نہاتے ہیں کتے
کبھی اُس میں ہم کو گراتے ہیں کتے

مزا راگ بھیروں کا آتا ہے ہم کو
کہیں سُر میں جب سُر ملاتے ہیں کتے

شرابور کر کے پسینے میں ہم کو
عجب کیف سا ایک پاتے ہیں کتے

جو دن میں دکھائی نہ دیں اتفاقاً
تو پھر خواب میں دندناتے ہیں کتے

یہ واجب ہے ہم ان کا احسان مانیں
ہمیں کیسی ورزش کراتے ہیں کتے

جو ہوتی ہے قد سے بھی اونچی ہمارے
وہ دیوار ہم کو ٹپاتے ہیں کتے

نہیں اِن کی مشرق میں کچھ قدر عاصیؔ
مگر اہلِ مغرب کو بھاتے ہیں کتے

مرزا عاصیؔ اختر

انگلش کی مار

ڈاکٹر سعید اقبال سعدی

مجھے کہنا ہے حالِ دل بڑا دشوار انگلش میں
وہ کہتی ہے کرو تم پیار کا اظہار انگلش میں

کہا میں نے کہ میں اردو میں حالِ دل سناتا ہوں
مجھے تو کہہ کے اُس نے کر دیا انکار انگلش میں

کہا میں نے کہ اُس کے حسن پر اشعار لکھتا ہوں
وہ بولی تم لکھو میرے لئے اشعار انگلش میں

مجھے انگلش کی گٹ پٹ ڈگری لے کر بھی نہیں آئی
کھپایا میں نے سولہ سال سر بیکار انگلش میں

میں آئی لو یو کہوں تو مجھے اتنے لگاتی ہے
کہ جیسے احمقانہ کام ہے یہ پیار انگلش میں

میں انگلش اور اردو مکس کر کے جب کروں باتیں
وہ کہتی ہے کرو تم اس پہ استغفار انگلش میں

کبھی جب بولنی پڑ جائے تو ہکلانے لگتے ہیں
بہت بنتے ہیں یوں تو ہم بڑے فنکار انگلش میں

بہت سی لڑکیاں جب بات ہی انگلش میں کرتی ہیں
بڑا ہوتے ہیں ہم نادم ذلیل و خوار انگلش میں

میں سی ایس ایس کرنے کا بڑا ہی شوق رکھتا ہوں
مگر اس کے ہیں سب مضمون دل افگار انگلش میں

مجھے لگتا ہے ہم کو عشق ہو جاتا ہے انگلش سے
ہم اکثر فیل ہوتے ہیں دوانہ وار انگلش میں

پڑھائی چھوڑ کر ریڑھی لگا لیتے ہیں ہم اکثر
ہمیں پڑتی ہے اتنی مار آخر کار انگلش میں

شوہر کے نام

شوہر کو اپنے بیوی نے اک خط میں یہ لکھا
دل آپ کی وفا میں بہت بے قرار ہے

پردیس میں گئے ہوئے دس سال ہو گئے
جب سے گئے ہیں اب کے نہ چٹھی نہ تار ہے

آتے نہیں، نہ آیئے خرچہ تو بھیجئے!
پہلے تھا خرچ دس روپے اب دس ہزار ہے

جانے کے بعد آپ کے کتنے کھلے ہیں پھول
گھر ماشاء اللہ آپ کا باغ و بہار ہے

گو چھوڑ کر گئے تھے فقط ایک ہی نہال
اب منوں اور منیوں کی پوری قطار ہے

احمد علوی

فیس بک سٹیٹس

مالکن نے ایک دن غصے میں رضیہ سے کہا
"کیوں اری رضیہ نگوڑی! یہ تجھے کیا ہو گیا

آئے دن تو بن بتائے چھٹیاں کرتی ہے کیوں
کاٹتی ہوں جب تری تنخواہ تب مرتی ہے کیوں

اب بتا کمبخت دو دن سے کہاں تو مر گئی"
سنتے ہی رضیہ پٹاخہ جھٹ سے یوں گویا ہوئی

"کیوں خفا ہوتی ہو چھوٹی سی مری حرکت پہ تم
رحم کیوں کھاتی نہیں باجی! مری حالت پہ تم

کام کرتے جب مری حالت دگر گوں ہوگئی
ایک دن آرام کرنے کے لیے میں سو گئی

ہاں خدا لگتی ذرا کہیو کہ بتلایا نہ تھا
فیس بک پہ میرا اسٹیٹس نظر آیا نہ تھا

میرا اسٹیٹس جسے صاحب نے بھی لائیک کیا
اور نیچے "مس یو رضیہ" اتفاقاً لکھ دیا"

محمد خلیل الرحمٰن

محمد عارف

خانہ بدوش
(خالد مسعود)

ملتان کی چار چیزیں مشہور ہیں، گرد، گرما، گورستان اور خالد مسعود خان، کہ گدا گر تو اب ملتان کے نہیں پاکستان بھر کے مشہور ہیں۔ مزاح گو شعرا میں میرا پہلا تعارف خالد مسعود خان سے ہے۔

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب ان کا کالم ''ماٹھا'' ہوتا تھا، عید پر'' کشتِ زعفران'' میں ان کا کلام سنا اور اگلے روز ''ماٹھا کالم'' والے ایڈریس پر ایک ای میل کر دی، اپنی ایک نظم بھیجی اور کونٹیکٹ نمبر طلب کیا۔ دو چار دن تک کوئی جواب نہ آیا تو وہی فرض کر لیا جو عام طور پر بڑے لوگوں کے بارے میں فرض کیا جاتا ہے۔۔۔ کچھ دنوں بعد ایک میل موصول ہوئی جس میں سب سے پہلے وضاحت کی گئی کہ نظر کی خرابی کے باعث میں کمپیوٹر پر ڈائریکٹ نہیں پڑھ سکتا، میل ڈاؤن لوڈ کر کے پرنٹ کرتا ہوں، پھر ریپلائی۔ نظم سراہی گئی اور محنت جاری رکھنے پر زور دیا گیا، آخر میں کونٹیکٹ نمبر اور ایڈریس بھی تھا۔

پاکستان ٹیلی ویژن کے ایک مشاعرے کی ریکارڈنگ تھی، مجھے بھی دعوت نامہ ملا، مشاعرہ پڑھنے کا نہیں مشاعرہ دیکھنے اور سننے کا۔ مشاعرہ شروع ہونے میں کچھ دیر تھی، اسٹوڈیو سے باہر ایک بڑے کمرے میں ہمیں بٹھایا گیا جس میں لکڑی کی پارٹیشن کے بعد ایک چھوٹا کمرہ الگ کر دیا گیا تھا، خالد مسعود اس کمرے میں تھے۔ میں اُٹھا اور ان کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ کر انھیں دیکھنے لگا، انھوں نے میری طرف التفات مناسب نہ سمجھا اور بدستور اپنے کام میں منہمک رہے، کام کیا تھا، ڈیڑھ دو انچ کے پرزے پر ایک سادہ سے انک پین سے کچھ لکھ لکھا رہے تھے۔ میں بہ غور انھیں دیکھتا رہا، ایک جگہ پر کچھ غلطی ہوئی تو جیب سے وائیٹر نکال کر پھیرا، درستی کی اور اس تعویز پر ایک طائرانہ لیکن اطمینان بھری نظر ڈال کر اسے جیب میں رکھ لیا۔ میری طرف دیکھا تو میں نے مصافحہ کے لیے ہاتھ آگے بڑھا دیا ''محمد عارف۔''

بولے ''فرام واہ کینٹ؟''

''جی!''

ساتھ ہی کھڑے ہوگئے، گلے ملے صحت، طبیعت دریافت کرنے کے بعد گھر اور گھر والوں کی خیریت دریافت کی۔ پہلی ملاقات پر کسی سے اس قدر محبت اور اپنائیت کے اظہار پر عجیب سا لگا لیکن اب تو عادت سی ہوگئی ہے۔ ادھر فون پر رابطہ ہوا یا ملاقات ہوئی ادھر انھوں نے والدین، بہن بھائیوں اور بیگم کی خیریت دریافت کرنے میں پہل کی، پھر کوئی اور بات ہوئی۔

۱۹۹۸ء کی بات ہے ایک ادارے میں اعلیٰ عہدے پر متمکن تھے کہ اچانک مستعفی ہوگئے۔ وجہ دریافت کی تو بولے "میں ایک کتاب پڑھ رہا تھا جس میں لکھا تھا کہ جو شخص چالیس برس تک نوکری کرلیتا ہے وہ باقی ماندہ زندگی میں اور کچھ نہیں کرپاتا بس یہی کچھ کرتا ہے۔ بات دل کو لگی، میں نے حساب لگایا تو میری عمر ۳۹ سال اور چھ ماہ کے قریب نکلی، سو ایک مہینے کے نوٹس پر استعفیٰ دے دیا۔ اگلے روز بگ باس نے بلایا اور کہا "بندۂ خدا، اتنی اچھی نوکری پر لات مار کر کیا کرے گا، کدھر جائے گا، کیا کھائے گا، بچے ابھی اسکول میں ہیں، کوئی نئی نوکری مل گئی ہے؟"

"نہیں تو۔۔۔"

اچھا یہ استعفیٰ اُٹھاؤ، اچھی طرح غور کرکے کل رپورٹ کرو۔ استعفیٰ اُٹھایا اور گھر چلا آیا، ٹھنڈے دماغ سے غور کیا تو باس کی ساری باتیں دُرست نکلیں، سوچنا شروع کیا تو سوچتا ہی چلا گیا۔ ساری سہولتیں، آسانیاں اور اپنا اسٹیٹس سامنے رکھا، اُٹھا اور اُٹھ کر استعفیٰ پھاڑ دیا۔۔۔ نیا استعفیٰ لکھا ایک دن کے نوٹس پر۔۔۔ اور پرسکون ہوگیا، دفتر سے نکلا تو ڈرائیور بھی ساتھ چل پڑا، شاید یہ بھی چالیس کے قریب تھا۔

چہرہ بھرا بھرا بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ، سر: سفید، ڈاڑھی: سیاہ، مونچھیں گاما پہلوان مارکہ، ڈاڑھی کے بال گالوں تک آجانے سے چہرے کے رعب میں اضافہ ہوگیا ہے، کشادہ ہوتی پیشانی پر نماز کا گٹا، ناک موٹی اور چوڑی، آنکھیں سوئی سوئی سی لیکن روشن جن پر بائی فوکل چشمہ، چہرے پر بلوچ سارbانوں جیسی سختی اور درشتی، رنگ خاص پاکستانی یعنی نہ چٹا نہ کالا، دیکھنے میں گم صم سا، پہلی ملاقات پر یوں محسوس ہوتا ہے کہ بہت کم گو ہوگا، قد میانہ جو توند اور فربہی کے باعث چھوٹا لگتا ہے۔ ہر "ہال" اور "حال" میں خوش اور مصروف نظر آنے والا یہ شخص ان لوگوں میں سے ہے جن کی شخصیت اور خوب صورتی عمر کے ساتھ ساتھ مزید نکھرتی جاتی ہے۔

"سر کے بال سفید اور ڈاڑھی کالی سیاہ، چہرے پر یہ رات دن کا منظر۔۔۔ کچھ سمجھ نہیں آتا؟" ٹی وی پروگرام میں خاتون اینکر نے بڑی ادا سے خالد مسعود سے پوچھا۔

اپنے مخصوص انداز میں بولے "بی بی! اس میں پریشانی کی کیا

خالد مسعود کی شاعری پر حاضرین محفل کا ایک عمومی منظر

بات ہے ڈاڑھی بالوں سے پورے سترہ سال چھوٹی ہے۔"

چائے سے بے زار، کافی کا طلب گار، سافٹ ڈرنکس میں ماسوائے لیمن کے کچھ پسند نہیں، ہاں جوس ہر قسم کا مرغوب ہے۔ کھانا ہمیشہ اچھا اور سیر ہو کر کھاتا ہے۔ جسم مضبوط اور پھرتیلا جب کہ ڈیل ڈول بہ حیثیتِ مجموعی پہلوانوں جیسا، آپ اسے انوکی پہلوان کا "سمال ورژن" بھی کہہ سکتے ہیں، ویسے اگر پہلوان ہوتا تب بھی دنگل گفتگو کے زور سے ہی جیتتا، چال ڈھال اور حرکات و سکنات سے تیزی جھلکتی ہے، بیٹھے ہونے کے بجائے چلتے پھرتے زیادہ خوب صورت اور بھلا لگتا ہے، بارعب اور اَلھڑ چلبلا لیکن ایک خاص قسم کی سست اور کاہل طبیعت کا مالک بھی جس پر کبھی کبھی موڈ کا غلبہ بھی ہو جاتا ہے لیکن اس کے باوجود شخصیت میں ایسی کشش ہے کہ لوگ کھنچے چلے آتے ہیں۔

معلومات میں "گوگل" کہ کسی بھی موضوع پر بھی معلومات کے دریا بہا سکتا ہے، خوش گفتار، دل چسپ، حاضر جواب اور محفل پر چھا جانے والا۔ ظاہری غیر سنجیدہ اور اندرونی مفکر۔ چیلنج دینے اور قبول کرنے والا، نمود و نمائش اور فضول خرچی سے گریزاں۔ روایت سے جڑا ہوا روشن خیال اور کاروباری۔ خالد مسعود مستقبل سے بے فکر اپنی دھن میں رہنے والا ایک انتہائی لاپروا، ذہین اور مہم جُو انسان ہے جو منہ پھٹ، چرب زبان، جملے باز اور لگائی بجھائی کا ماہر ہے۔ بحث و مباحثہ میں بھی جارح ہے، بقول ڈاکٹر انوار احمد "بڑا چھری مار طالب علم تھا۔" منطق میں دور کی ایسی کوڑی لاتا ہے جو مخاطب کے فرشتوں کے سان گمان میں بھی نہیں ہوتی اور پھر اس بنیاد پر جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ بنانے کے فن میں بھی طاق ہے۔ غصے میں پارہ دیکھتے ہی دیکھتے چڑھ جاتا ہے لیکن واپس بالکل اسی طرح اور اسی رفتار سے آتا ہے جیسے بی پی آپریٹس میں پریشر ریلیز کرنے پر پارہ گرتا ہے۔ اس کی گفتگو جزئیات نگاری کا مرقع ہوتی ہے، دورانِ گفتگو اختلاف کی صورت میں فوراً شرط لگانے پر آ جاتا ہے۔ قریبی احباب میں سے کوئی بندہ بشر اس سے شرط نہیں باندھتا، کہ خالد مسعود سے کسی کو شرط جیتتے نہیں دیکھا گیا۔

بلبل اور جگنو

جگنو بولا لوفر پنچھی ادھی رات کو شاخ پہ بیٹھا ایں
گھر جا کر تو سو مر لے کہ رات یہ اتنی تتی کوئی نہیں
بلبل بولا گھٹیا کیڑے تجھ کو جگتیں سوجھ رہی ہیں
تیری دم پر یو پی ایس ہے ساڈے گھر میں بتی کوئی نہیں

خالد مسعود

کپڑوں میں شاذ و نادر دکھائی دیتا ہے، اکثر جین کی پینٹ میں ہوتا ہے، جس کے اوپر ڈریس اور کبھی ٹی شرٹ۔ گرمیوں میں ہاف سلیوٹی شرٹ اور کبھی ڈھکن لگی ڈبل جیبوں والی ٹی ٹی مارکہ شرٹ جس کے شولڈرز پر رینک بھی لگائے جا سکتے ہیں، شرٹ کے اوپری دو بٹن عموماً کھلے ہونے کے باعث سینے کے بلیک اینڈ وائیٹ بال جھانکتے نظر آتے ہیں۔ سردیوں میں "کاٹرائے کوٹ" یا ایک جیکٹ اس کے ہمراہ ہوتی ہے۔ سفر میں رات ہوئی تو کاٹرائے کوٹ اتارا اور تہہ کر کے تکیہ کے نیچے رکھ لیا۔ کہا اسے لٹکا دیتے ہیں۔ بولے "ناں ناں! اسے اس طرح سرہانے کے نیچے رکھ کر سونے سے اس کی کریس میں اضافہ ہوتا ہے۔"

پاؤں میں جوتے ہمیشہ اچھے برانڈ کے لیکن سادہ اور آرام دہ۔ شنید ہے کہ ایک زمانے میں دو چار تھری پیس بھی تھے لیکن اب کدھر ہیں اس بارے میں راوی خاموش ہے۔ لباس کے معاملے میں اس قدر لاپروا کہ بسا اوقات ایک ہی ڈریس یعنی جین اور شرٹ میں ٹی وی کے کئی مشاعرے بھگتا دیے، سوتے وقت پتا نہیں کہاں سے "دھوتی مارکہ" شالس برآمد کر کے پہن لیے، پینٹ شرٹ کھونٹی پر لٹکا دی جسے صبح جھاڑ کر پھر پہن لیا۔ دورانِ سفر اپنے

ساتھ اپنے علاوہ کچھ رکھنے کا قائل نہیں۔ بیرونِ ملک مہینے سوا مہینے کا سفر دو تین شرٹس اور ایک ادھ جین میں گزار کے آجاتا ہے۔ گرم ملبوس کی ضرورت پڑے تو وہیں کسی سے جیکٹ وغیرہ ادھار پکڑی، ٹور گزار کر واپس اس کے متھے مار آئے۔

جملہ بازی میں اس کا اپنا اسلوب اور طریقۂ واردات ہے جس میں شگفتگی، طنز اور کاٹ ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ سامعین اور محفل جیسی بھی ہو اظہارِ خیال کے لیے پنجابی زبان کو ترجیح دیتا ہے، پنجابی ایک خاص سٹائل اور لہجے میں بولتا ہے، دورانِ گفتگو دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی سے مخاطب کو للکارتا بھی رہتا ہے، اندازِ بیاں اس قدر دل نشیں، مدلل اور منطقی ہوتا ہے کہ کوئی قطع کلامی کی کوشش نہیں کرتا۔ ٹی وی شوز میں اُردو یا انگریزی میں بات چیت کر رہا ہو تب بھی لہجہ خاص ملتانی ہوتا ہے۔

دورانِ مشاعرہ جب کوئی دوسرا پڑھ رہا ہو تو ساتھ والے کے کانوں میں نان سٹاپ کمنٹری جاری رکھتا ہے، اس دوران باکمال جملوں اور پنچ لائنوں کا تسلسل رہتا ہے جیسے انور مسعود اپنی مشہور نظم ''بنین'' سناتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں بتا رہے تھے ''اس نظم کے کئی زبانوں میں تراجم ہو چکے ہیں لیکن مجھے یورپ کی فلاں یونیورسٹی کے فلاں پروفیسر کا ترجمہ اور توضیح بہت پسند آئی، جس میں اس نے کہا ہے کہ انور مسعود کی ''بنین'' دراصل ''مغربی ثقافت'' ہے، جس کو اہلِ مشرق پہننے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ان کو پوری نہیں آتی۔''

خالد مسعود نے ساتھ والے کے کان میں سرگوشی کی: ''ایہہ مطلب انہاں نوں خود اُسے دن پتہ چلیا سی۔''

سامع نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا، خود فوراً پیچھے ہٹ کر ایک شریف سامع بن گئے لیکن ساتھ والا تماشا بن گیا۔

لطیفہ گوئی میں اسے ملکہ بلکہ بادشاہت حاصل ہے۔ لطیفہ کی افادیت اس کی جامعیت اور اختصار میں ہوتی ہے لیکن یہ طویل لطیفے بھی سناتا نظر آتا ہے جن میں مکمل پلاٹ اور جزئیات نگاری کے ساتھ ساتھ موقع کی مناسبت سے ترمیم و تحریف بھی ہوتی رہتی ہے، ایسے لطیفوں میں کئی کئی کلائمیکس ہوتے ہیں، یہ لطیفے اسی سے

مقدر خراب است

گر ٹکا چلاتے ہیں تو ٹکا نہیں چلتا
اور تیر چلاتے ہیں تو تُکا نہیں چلتا

ٹکی نکل آئے تو ٹکی نہیں چلتی
دُکا نکل آئے تو دُکا نہیں چلتا

بے وقت پڑے توپ وی چل جاتی ہے اپنی
اور وقت جو پڑ جائے تو مُکا نہیں چلتا

تعویز جو لے آئیں تو ہو جاتا ہے بے کار
اور رقعہ جو لے آئیں تو رقعہ نہیں چلتا

میرٹ کو ٹرائی کیا سو بار تو جانا
اس ملک میں میرٹ بھی تو سکا نہیں چلتا

خالد مسعود

مخصوص ہیں۔

مزاحیہ شاعری میں انوکھا اسلوب اور خالص مزاح اس کی پہچان ہے، آواز کے اتار چڑھاؤ سے خوب واقف ہے جس کے باعث کلام کی تاثیر اور لطف میں اضافہ ہو جاتا ہے، گفتگو میں کھلتا جب کہ شاعری میں لہجہ عموماً بلغمی ہوتا ہے۔ شعر پڑھنے کا انداز بہ ظاہر روکھا پھیکا لیکن درحقیقت بہت جان دار ہے کہ اسی بھولے بھالے انداز سے مشاعرہ لوٹ لیتا ہے، پڑھتے ہوئے کبھی چہرے پر مسکان نہیں ابھری، ہاں سنجیدگی ایسی ہوتی ہے جیسے مرثیہ پڑھ رہا ہو۔ کبھی مکرر نہیں ہوا، ایک بار جو پڑھ دیا سو پڑھ دیا۔ نہ داد دی اور نہ کبھی شعراء کے عام دستور کے مطابق آداب کہہ کر یا ماتھے پر ہاتھ لے جا کر وصول کی۔

چناب کلب فیصل آباد کا مشاعرہ بیٹھ بلکہ تقریباً لیٹ چکا تھا۔ ناظمِ مشاعرہ نے ممدوح کو دعوتِ سخن دی کہ آئیں اور مشاعرے کو اُٹھائیں۔ خالد مسعود ڈائس پر آئے اور آتے ہی صرف اتنا کہا ''اے مشاعرہ تے ہن اللہ ہی چکّے تے چکّے''۔۔۔ اور مشاعرہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔

لندن میں ایک مشاعرہ خالد مسعود کی صدارت میں ہو رہا تھا ایک شاعر تشریف لائے ''صاحبِ صدر! آپ کی اجازت سے پہلے ایک شعر پھر دو، پھر چار غزلیں اور پھر تین نظمیں۔''

اِس تمہید کے بعد سٹارٹ ہو گئے، یہ سب سنا کے گویا ہوئے ''صاحبِ صدر! روز روز آپ کی صحبت کہاں میسر آئے گی، اگر وقت ہو تو میں کچھ اور سُنانا چاہتا ہوں۔''

موصوف نے پاؤں صوفے کے اوپر کھینچ لیے اور کہا ''جاری رکھیں میری فلائٹ پرسوں ہے۔''

پنجاب یونیورسٹی لاہور کی محفلِ مشاعرہ میں گورنر خالد مقبول مہمانِ خصوصی تھے۔ گورنر صاحب نے کسی میٹنگ میں جانا تھا اور اُن کی خواہش تھی کہ خالد مسعود کو سن کر جائیں۔ انتظامیہ کے کرتا دھرتا خالد مسعود کے پاس آئے ''جناب یہ آپ کا مقام تو ہرگز نہیں ہے لیکن گورنر صاحب کی مجبوری کے باعث آپ آغاز میں پڑھ لیں، اس کے بعد آپ کو آپ کے نمبر پر بھی پڑھایا جائے گا۔''

''لفافے کتنے دیں گے؟''

جواب آیا: ''ایک۔''

''تو پھر ایک جگہ جہاں جی چاہے پڑھالیں۔''

ایک بار فرمانے لگے ''میرے پاس پندرہ 'وسچز' ہیں جن میں سے چار ممنوعہ بور کے ہیں۔''

''آپ ان کا کرتے کیا ہیں؟''

''کرنا کیا ہے، سال کے سال صاف کرتے ہیں۔''

وضو کرتے ہوئے مخاطب ہوئے ''یار وہابی ہونے کے بڑے فائدے ہیں۔''

''مثلاً؟''

میری طرف دیکھتے ہوئے خاموشی سے پاؤں جوتوں سے باہر نکال کے جرابوں کے اوپر مسح کیا اور یہ جا وہ جا۔

یونیورسٹی کے طالب علموں نے شام منائی تو صدارتی خطبے میں ارشاد فرمایا ''ایک یونیورسٹی سے نکالا گیا، ایک سے میں خود نکل گیا، پھر بہاؤالدین زکریا یونی ورسٹی جس سے میں نکالا گیا تھا، اس سے اس دور میں MBA کیا جب MBA ابھی ٹھیک طور سے پیدا بھی نہیں ہوا تھا، اپنے دور میں سٹوڈنٹ سیاست میں فعال کردار ادا کیا، ذرا سی بات پر جلوس اور جلوس نکال لینا بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ ہماری نعرہ سازی اور نعرہ بازی کا ایک زمانہ قائل اور گھائل رہا۔۔۔ لیکن آپ نے یہ سب کچھ نہیں کرنا، اب وہ زمانہ نہیں رہا، ہمارے دور میں Average سٹوڈنٹ بھی چل جاتا تھا لیکن آج Topper بھی مارے مارے پھرتے ہیں۔۔۔۔''

مجلسی آدمی ہے، یاروں کا یار ہے، جہاں کسی کا دور دور تک کوئی مونس و غم گسار نہ ہو وہاں بھی اس کے پانچ سات لنگوٹیے عموماً نکل آتے ہیں، بچے زمانوں کا شخص ہے اور غالباً اس وقت لنگوٹ بھی سستے ہوتے تھے۔ اس کے ملتانی دوستوں کا ایک گروہ تو صرف گپ شپ کا قائل ہے جو لکھنا پڑھنا تو ایک طرف رہا محفل میں سوچنے کی بھی اجازت نہیں دیتا، ایسی ہی ایک محفل میں کسی نے سوال کیا ''خالد شاعر اچھا ہے کہ جرنلسٹ؟''

جواب آیا ''اچھا انسان۔''

دیارِ غیر کی مارکیٹوں میں پھرتا پھراتا، بیٹیوں کے لیے ملبوسات پسند کرتا اور پھر موبائل کیمرے سے انھیں رنگ اور ڈیزائن دکھاتا، اسد کے لیے جیکٹ اور شرٹس دیکھتا، اپنے آپ میں گم، گھومتا پھرتا اور لطف اندوز ہوتا۔

''یہ سب تو یہاں سے بھی مل جاتا ہے اور آپ تو دورانِ سفر سامان سے بے حد الرجک ہیں، اِتنا کچھ کیوں اُٹھا لیتے ہیں؟''

''یار! میں جب گھر جاتا ہوں تو ان چیزوں سے بچوں کے چہرے پر جو خوشی آتی ہے اس کا کوئی نعم البدل نہیں۔''

''اُس کے جانے کے بعد وقت کا سارا تصور اور مفہوم ہی بدل گیا ہے۔ آج اسے رخصت ہوئے پورے تین سال گزر گئے ہیں لیکن یہ تین سال ایسے تھے کہ جن میں ہر سال تین سو پینسٹھ دن

پر تو ہر گز مشتمل نہیں تھا۔ کبھی لگتا ہے کہ یہ تین سال اتنے لمبے اور طویل ہیں کہ اس کے ساتھ گزارے ہوئے چھبیس سال، چھ ماہ اور سترہ دن کا عرصہ ان کے سامنے پل دو پل کا عرصہ محسوس ہوتا ہے اور کبھی لگتا ہے کہ وہ درسِ قرآن پر گئی ہے اور آنے والی ہو گی۔ ابھی کل کی بات لگتی ہے کہ میں اس کے بستر کے بائیں طرف اس کا ہاتھ تھامے کھڑا تھا اور ڈاکٹر نے اس کے منہ پر لگا آکسیجن ماسک اتارا اور اپنا سٹیتھو اسکوپ کانوں سے اتار کر گلے میں لٹکا لیا۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ وہ تو جب کومل کمرے کی دیوار کے ساتھ لگ کر خاموشی سے ہچکیاں لینے لگی تب مجھے سمجھ آیا کہ کھیل ختم ہو گیا ہے۔۔۔ اسے کومل کی شادی کا شوق تھا، وہ اس کے جانے کے بیس دن بعد ہوئی۔ اسے سارہ کے رزلٹ کا انتظار تھا، اس نے ماں کے جانے کے بعد یونی ورسٹی میں ٹاپ کیا۔ اسے انتظار تھا اسد کب میرے جتنا اونچا ہو گا، اسد مجھ سے اونچا ہو گیا ہے۔۔۔''

خالد مسعود اس کی زندگی میں بھی خالد مسعود ہی تھا، اب بھی ہے لیکن خالی خالی اور کھوکھلا کھوکھلا سا، اس کی آوارہ گردی اور خانہ بدوشی میں فرق تو اب بھی نہیں آیا لیکن جاننے والے اب اس کی ہنسی میں نمی کو محسوس کرتے ہیں، بے شک ہر کامیاب مرد کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔

پہلے آوارہ گردی برائے آوارہ گردی تھی لیکن اب بیرونِ ملک جاتے ہوئے تدبیر اور کوشش کی جاتی ہے کہ امریکا رستے میں پڑے اور اس تبدیلی کی وجہ ''کوچو'' ہے، سال میں ایک آدھ ٹور خالصتاً اس کے لیے لگا لیا جاتا ہے۔ ''کوچو'' امریکا میں مقیم ان کے نواسے کا ''نک نیم'' ہے اور بتانے کی ضرورت نہیں کہ یہ نام موصوف ہی کا عطا کردہ ہے۔

ملتان بھی اس کی محبت اور کمزوری ہے کہ اس شہر سے اس کا بچپنا، جوانی، یادیں، حسرتیں، تمنائیں اور خواب جڑے ہیں۔ اندرونِ ملک ایک شہر سے دوسرے شہر جاتے ہوئے چند گھنٹے بھی میسر آئیں، موصوف گھر یعنی ملتان آ جاتے ہیں اور پردیس۔۔۔ پردیس تو جانے سے پہلے ہی اسے ملتان کی یاد ستانے لگتی ہے اور واپسی کی منصوبے بننے لگتے ہیں۔

''یار ملتان ایک آئیڈیل شہر ہے، پاکستان کے ان چند شہروں میں سے جو زندہ ہیں، اس شہر کی کئی خوبیاں ہیں۔۔۔''

میں نے بات کاٹتے ہوئے پوچھا ''مثلاً؟''

''مثلاً یہ کہ یہ بہت سست شہر ہے اور پھر یہ کہ بیس منٹ میں پورے شہر کا چکر لگایا جا سکتا ہے اور اس میں خوبیاں ساری بڑے شہروں والی ہیں، ہاں بڑے شہروں کی خرابیوں سے کافی حد تک پاک ہے۔''

''اور؟''

''اور یہ کہ ''پاک مائی کے قبرستان میں میرے خاندانی احاطے میں قبروں کی چار قطاریں ہیں، پہلی قطار میں میری پڑدادی، ابا جی کی دو پھوپھیاں، چچا رؤف، اماں، اور دور رشتہ دار دفن ہیں۔ دوسری قطار میں تایا جی، دادا جی، دادی اماں، میری بڑی بہن، بڑا بھائی اور میری بیٹی دفن ہیں۔ تیسری قطار میں میری ماں اور ان کے پہلو میں ابا جی دفن ہیں، ابھی اس قطار میں کئی قبروں کی جگہ خالی ہے مگر میری اہلیہ چوتھی قطار میں دفن ہے اس کے پہلو میں تین ضرب سات فٹ کا بیش بہا پلاٹ خالی ہے، یہ پلاٹ میری ماں کے قدموں کے عین نیچے ہے، یہ پلاٹ صرف میرے لیے خالی پڑا ہے۔ میں یہ پلاٹ پوری کائنات میں اور کسی جگہ نہیں خرید سکتا، پاک مائی کے قدیمی قبرستان میں موجود اس پلاٹ کو چھوڑ کر میں بھلا کہاں جا سکتا ہوں۔''

محمد عارف کا تعلق واہ کینٹ سے ہے۔ موصوف درس و تدریس سے وابستہ ہیں۔ اُردو ادب میں ایم فل کر رکھا ہے، جس میں پیش کردہ مقالہ ''مزاحیہ غزل کے خدوخال'' کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔ موصوف ایک بہت عمدہ مزاحیہ شاعر ہیں اور تقریباً برقی میڈیا کے ہر قابلِ ذکر مشاعرے میں رونق افروز ہوتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں شگفتگی اور چلبلاہٹ کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ ''ارمغانِ ابتسام'' میں کے دیرینہ اور مستقل مزاحی سے لکھنے والوں میں شامل ہیں۔

ارمان یوسف

برمنگھم کا ادبی منظر نامہ

لندن ایکسپریس کا تیرہواں باب

شاعر اور ترکھان جہاں کہیں بھی ہوں اپنے پیشے کی مصروفیات کا بہانہ نکال ہی لیتے ہیں۔ ترکھان جنگل میں کہیں اکیلا بھی ہو تو لکڑیاں کاٹ کے پنجرہ بنا ڈالے گا چاہے اس میں خود کو ہی قید کر بیٹھے۔ یہی حال شاعروں کا ہے۔ یہ اپنی ذات میں انجمن ہوتے ہیں۔ ایک غزل سننے سنانے کی خاطر کیا کیا جتن کر گزرتے ہیں۔ عباس ملک ہی کو لے لیجیے۔ پارٹ ٹائم شاعر ہونے کے باوجود پچھلے ۲۵ سال سے ادبی رونقیں لگائے ہوئے ہیں۔ ''فانوس'' ایسی چلائی کہ آج بھی ادبی کرنیں شبستان برمنگھم میں اجالا کیے ہوئے ہیں۔ ایک عباس ہی پہ کیا موقوف؛ کیا لندن، کیا مانچسٹر اور کیا بریڈفورڈ ہر جگہ ادبی حلقے اردو ادب کی شمع جلائے ہوئے ہیں۔

مانچسٹر کا ذکر چلا تو غزل کے شاعر ناصؔر کاظمی کے صاحبزادے باصؔر کاظمی یاد آئے۔ خیر سے اب تو وہ بھی ایم بی ای بن گئے ہوئے ہیں۔ ان کی شاعری سے تو آپ واقف ہیں ہی، طبیعت میں شائستگی بھی کمال کی پائی ہے۔ ایک روز مشاعرہ ختم ہونے پر نجی محفل میں کسی صاحب نے بڑے محتاط انداز میں اُن سے پوچھا ''جی

آپ کا ناصر کاظمی صاحب سے کوئی تعلق تو نہیں؟"

باصر صاحب بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دیتے ہوئے معصومیت سے بولے "جی کچھ خاص تو نہیں، بس وہ میرے والد صاحب ہیں۔"

خیر، واپس آتے ہیں برمنگھم کی "فانوس" کی جانب جواب بھی پروانوں کو اپنی جانب کھینچ رہی ہے۔ ان دنوں مرتضٰی برلاس کی آمد آمد ہے۔ ان کے اعزاز میں "سلطان باہو ٹرسٹ" کے مرکزی دفتر اور تکبیر ٹی وی کے سٹوڈیو میں مشاعرے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ طے یہ تھا کہ تکبیر ٹی وی کے پروگرام "سخن ستارے" میں انٹرویو کے بعد مشاعرہ رکھا جائے گا، ان کے انٹرویو اور مشاعرے کے بنیادی محرک خوبصورت لفظوں کے شاعر اور پھولوں جیسی شخصیت اسد ضیا تھے جو تکبیر ٹی وی کے پروگرام ڈائریکٹر بھی ہیں۔ برلاس صاحب کی خواہش پہ صرف چند شعراء اور با ذوق سامعین ہی مدعو کیے گئے تھے۔ "سٹارٹر" کے طور پر چند اشعار مقامی شعراء نے کلام پیش کیا اور پھر برلاس صاحب! اچھے بھلے نفیس انسان سٹیج پر گرجنے برسنے لگے۔ سامعین کو جیسے انھوں نے مسحور کر لیا ہو۔

ان کو آنکھیں مت کہو، چہرے پہ دو دھبے کہو
ورنہ اتنا ظلم کب آنکھوں سے دیکھا جائے ہے

بس اس شعر تک تو ہماری سماعتوں نے ساتھ دیا، پھر اس کے بعد داد دینا بھی بھول گئے۔ پورا بدن سراپا داد و تحسین بن چکا تھا، برلاس صاحب نے آخری شعر پڑھا ہم نے کھڑکی کے اس پار جھانکا تو سورج ابھی چمک رہا تھا۔ یوں لگا جیسے دس منٹ ہی مشاعرہ رہا ہو مگر گھڑیال دو گھنٹے آگے جا چکا تھا۔ برلاس صاحب نے یوں مسحور کیے رکھا کہ وقت گزرنے کا احساس تک نہ ہوا۔

حسنِ اتفاق دیکھیے کہ اگلے چند روز ہی میں معروف شاعر، مزاح نگار اور کالم نگار عطاء الحق

قاسمی و ہمنوا یعنی عزیز احمد اور راشدہ ماہین ملک آنے والے تھے۔ یہ تقریب بھی سلطان باہو ٹرسٹ برمنگھم کے زیر اہتمام رکھی گئی تھی اور قاسمی صاحب بطور خاص اپنی سترویں سالگرہ منانے کے سلسلے میں یہاں آئے ہوئے تھے۔ چشم براہان میں منصور آفاق سرفہرست تھے۔ کانفرنس میں شرکت کا موقع تو نہیں ملا تھا البتہ شام ڈھلے قاسمی صاحب کے اعزاز میں منعقدہ مشاعرے میں ہم بھی واسکٹ چڑھائے جا پہنچے تھے۔ یہاں ریشم لفظوں کی شاعرہ محترمہ یاسمین حبیب کو دیکھا تو باغ باغ ہوگئے۔

قاسمی صاحب نے ماضی کے چند گوشوں پہ روشنی ڈالی اور ایک مضمون بھی پڑھا۔ عزیز احمد نے قاسمی صاحب کے حضور نذرانۂ محبت پیش کیا اور پاکستان ہی سے آئی ہوئی شاعرہ راشدہ ماہین ملک نے بھی اپنا کلام عطا کیا۔ ہم نے بھی اپنی ایک غزل پیش کی، منصور آفاق نے بھی خوب محفل کو جمایا اور پھر یاسمین حبیب نے تو گویا دل ہی لوٹ لئے۔ سرِ شام محفل اختتام پذیر ہوئی۔

''تمہارا تلفظ اچھا ہے، کوشش کرو کہ اردو بولتے ہوئے انگریزی کے الفاظ مطلقاً ترک کردو!'' اختتامِ تقریب پہ ہم ہال سے باہر نکلنے والے ہی تھے کہ کونے سے ایک آواز آئی۔ مڑ کے دیکھا تو انسان نما ایک چیز پہ نظر پڑی۔ لمبے لمبے سفید بالوں پہ بچی ایک سفید ٹوپی نے اٹھارویں صدی کی یاد تازہ کردی۔

''جی آپ نے کچھ کہا؟''

جواباً وہ صاحب مسکرائے تو انکشاف ہوا کہ منہ میں دانت بھی رکھتے ہیں ''کہاں چل دیے برخوردار؟''

''اپنے میزبان کے پاس جو باہر گاڑی میں منتظر ہوگا!''

''آؤ ذرا چائے پیتے ہیں!''

انتظامیہ کی طرف سے چائے پانی کا بندوبست کیا گیا تھا مگر ہم تکلفاً باہر جانے لگے تھے کہ بابا جی نے دعوت دے ڈالی۔

''خاکسار کو خوش مزاج کہتے ہیں، خوش مزاج لکھنوی!''

''بہت خوبصورت نام ہے!'' ہم نے بھی دل رکھنے کو کہا۔

''آداب عرض ہے۔''

لگتا تھا کہ لکھنوی صاحب اپنی تہذیب بھولے نہیں۔ ورنہ تو نئی تہذیب قوموں تک کو نگل گئی، رسم و رواج کی بات ہی کیا۔

''میاں برخوردار! یہ عطا الحق قاسمی کے بارے میں کیا نکتۂ نظر ہے تمہارا؟''

''جناب وہ تو ادبی افق پہ ایک دمکتا ستارہ ہیں۔ ملک کے نامور مزاح نگار، شاعر اور کالم نگار ہیں۔ ٹیلی ویژن پر بھی اکثر جلوہ گر ہوتے ہیں۔''

''کسی حد تک تمھاری بات ٹھیک ہے مگر ریڈیو، ٹی وی، اخبار وغیرہ ادبی قامت کا پیمانہ تھوڑی ہیں۔ میں یوں ہی نہیں کہہ رہا ان کا نمائندہ شعر ذرا ملاحظہ کیجئے

ظلم بچے جن رہا ہے کوچہ و بازار میں
عدل کو بھی صاحبِ اولاد ہونا چاہئے

یہ بچے جننا تذکیر یعنی مرد کا کام کب سے ہوگیا؟ انہوں نے تو کمال ہی کردیا۔''

''مگر موضوع اور خیال کے اعتبار سے خوب شعر کہا ہے قاسمی صاحب نے!'' ہم نے حمائت کی۔

''برخوردار! قواعد و ضوابط بھی تو کوئی چیز ہیں کہ نہیں اور رہی بات ان کی مزاح نگاری کی، اگرچہ بعض جملے بڑے تیکھے اور معنی خیز ہوتے ہیں مگر چارپائی اور دھوتی جیسے الفاظ کو ذریعۂ اظہار بنا کر بازاری جملے بازی سے ہنسی تو آجاتی ہے مگر جگت تو جگت ہی ہے نا! جو بھانڈوں کا کام ہے نہ کہ ادیبوں کا۔ سنا نہیں تھا تم نے، موصوف نے اپنا ایک پرانا مضمون پڑھتے ہوئے چار الفاظ کا تلفظ بھی غلط ادا کیا!''

ایک لمحے کو خاموشی چھا گئی، خوش مزاج کے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔

''اچھا ہوا آپ چند روز قبل برلاس صاحب والے مشاعرے میں نہیں آئے ورنہ اتنے خوبصورت مشاعرے میں بھی سو سو کیڑے نکالتے۔''

''ارے مرتضٰی برلاس! بھئی وہ کب آیا؟''

''کچھ ہی دن ہوئے ویلز میں مقیم اپنے بچوں بینش اور ڈاکٹر

اسامہ سے ملنے آئے ہوئے تھے۔کوئی شاعرانہ دورہ نہیں تھا اس لئے کسی کو بھنک نہیں پڑی اسد ضیا نے ان کی خوشبو پالی اور وہ بھی اسد کی درخواست پر چلے آئے،خوب رہا مشاعرہ۔''

یہ کہتے ہی ہم نے جان چھڑانے کی کوشش کی کہ بڈھے کا کیا بھروسہ پہلے بھی ہمارے پسندیدہ ادیب کے بارے میں ہرزہ سرائی کر چکا ہے۔اب بھی نجانے کیا کیا بولتا چلا جائے۔

''براس اچھے شعر کہتا ہے موضوع اور خیالات کی تکرار بھی نہیں اور ہمہ جہتی بھی اس کی شاعری کا خاصہ ہے۔بات کر کے مکرتا بھی نہیں اور نتیجۂ کلام پیش کرتا ہے نا کہ ابتدائی تصورات۔۔۔ ناقدین اسے بجا طور پر ترجمانِ عصر کہتے ہیں۔''

''براس صاحب کی طرف داری آپ اس لئے کر رہے ہیں کیونکہ ان کے شجرۂ نسب کی شاخیں مرزا غالب سے جا ملتی ہیں اور آپ مرزا نوشہ کو دل وجاں سے چاہتے ہیں۔''

خوش مزاج نے سر سے ٹوپی اتار کے ایک طرف رکھ دی ہاتھ میں پکڑا ہوا آدھا بسکٹ چائے میں ڈبونے کی بجائے واپس پلیٹ میں رکھ دیا اور بولا''اگر میرے ابا حضور بھی شاعری کا شغف رکھتے ہوتے تو میں ان کی بھی طرف داری کر کے ادبی خیانت کا ہرگز مرتکب نہ ہوتا۔''

ہم سخن فہم ہیں،غالب کے طرفدار نہیں

خوش مزاج نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا''میں تو ایک مدت سے براس کا شیدائی ہوں،میرے تکیے کے نیچے اس کے سو شعروں کا انتخاب ہوتا ہے جسے پڑھ کر محظوظ ہوتا رہتا ہوں ایک اور دلچسپ بات بتاؤں؟''

اب کے خوش مزاج نے عینک بھی اتار کے ایک طرف رکھ دی،لگتا تھا کہ ہوا میں تیر چلانے کا ارادہ ہے۔

''اتنا چاہنے کے باوجود بھی میں مرتضٰی براس سے ملنا نہیں چاہتا تھا،کیونکہ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کوئی شاعر تو بہت اچھا ہوتا ہے اس کی لیکن شخصیت داغدار ہوتی ہے مگر اس سے مل کر واہمات دور ہوئے وہ شاعر بھی اچھا ہے اور اور دیانت دار سیرت کا مالک بھی،اب نجانے پھر کب ملاقات ہو!''

نیا پاکستان

شرفو چھوٹا ہی تھا تب اس کے ماں باپ نے اسے لے کر پاکستان ہجرت کی تھی۔اس نے جب سنا کہ نیا پاکستان بن چکا ہے تو وہ جوش میں آ کر پھر ہجرت کے لیے تیار ہوگیا۔راستے میں کسی سے پوچھا''نیا پاکستان کس طرف ہے؟'' تو اس نے سامنے ایک ٹرک کی بتی کی طرف رہنمائی کی۔چلتے چلتے صبح ہوگئی،نیا پاکستان نہ ملا۔سڑک کے کنارے ایک کٹیا میں ایک رہنما بزرگ ملے۔کہنے لگے،''تمہارے اس سفر کا نام ہی نیا پاکستان ہے۔جوں ہی تھک کر بیٹھے،پرانے پاکستان میں رہ جاؤ گے۔''

محمد خلیل الرحمٰن

اتنے میں دور سے بشارت مغل آتا دکھائی دیا،جس سے دو دن قبل ہی ملاقات ہوئی تھی،قریب آتے ہی تردد سے بولا''آپ کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے؟''

وہ شاید پہچان نہیں پا رہا تھا۔

''بھئی ضرور دیکھا ہوگا ہم کون سا پردہ کرتے ہیں۔''

ایک دن سہیل وڑائچ کے ساتھ

اب آیا اونٹ پہاڑ کے نیچے۔معروف صحافی اور تجزیہ نگار سہیل وڑائچ کو بھی انھی دنوں برمنگھم آنا تھا کیا؟ سلطان باہو ٹرسٹ کے زیر اہتمام سید فیاض الحسن کے حکم کی تعمیل میں منصور آفاق نے جیو ٹی وی کے مشہور پروگرام ''ایک دن جیو کے ساتھ'' کی طرز پر ہی ''ایک دن سہیل وڑائچ کے ساتھ'' منانے کا پروگرام رکھا۔اسی سلسلے میں ہی دن ڈھلے سلطان باہو ٹرسٹ کے ہال میں ایک محفل رکھی گئی جسے ٹرسٹ کے چیئرمین پیر سید فیاض الحسن اور سید اعجاز

الحسن نے بھی رونق بخشی۔ سٹیج سیکرٹری کے فرائض کی انجام دہی کا قرعہ ہمارے نام کا نکلا، تلاوت ونعت کے بعد دیگر مقررین کے ساتھ ساتھ منصور آفاق کو بھی سٹیج پہ دعوت دی جو سہیل وڑائچ کی زندگی اور صحافتی خدمات بارے پورا ایک کالم لکھ لائے تھے۔

سہیل وڑائچ نے پاکستان کے موجودہ حالات پہ روشنی ڈالی اور اچھے مستقبل کی امیدیں بھی بانٹیں۔ ہال میں موجود سبھی شرکا نے آخر میں اپنے سوالات کے ذریعے یہ پیغام بھی دیا کہ وہ پاکستان کی محبت پاکستان سے باہر رہ کر بھی ملک کے اندر رہنے والوں سے زیادہ رکھتے ہیں اور اس کے مستقبل بارے زیادہ فکر مند رہتے ہیں۔

پروگرام تقریباً اختتام پذیر تھا کہ ایک طویل قامت شخص نے ہاتھ اٹھا کر سوال کرنے کی بجائے کھڑے ہو کر بغیر کسی تکلف کے بولنا شروع کر دیا ''وڑائچ صاحب یہ بتائیے کہ اس وقت پاکستان میں کسی بھی ٹی وی چینل پر اپنی نوعیت کا کوئی بھی معیاری پروگرام چل رہا ہے؟''

اس نے کچھ توقف کیا اور پھر بولا ''میرا نام ملک ارشد محمود ہے اور میں ۱۲ سال سے برطانیہ میں مقیم ہوں، اپنے آٹھ گھنٹے کے کام کے علاوہ کوئی اور مشغلہ نہیں سوائے ٹی وی دیکھنے کے۔ مجھے صرف اتنا بتا دیجئے کہ ہر سیاسی، سماجی، مذہبی، علمی وادبی اور سائنسی پروگرام کا معیار اتنا گرا ہوا کیوں ہے سوائے لڑائی جھگڑے، گالی گلوچ، ذہنی دباؤ اور مایوسی بانٹنے کے آپ کے ٹیلی ویژن کوئی اور کام بھی کر رہے ہیں؟''

ہال میں بدستور سناٹا چھایا رہا۔ تمام چہرے اب سہیل وڑائچ پہ مرکوز ہو گئے۔ میسنی سی صورت بنا کر لوگوں کے بیڈروم میں گھس کر ذاتی قسم کے سوالات پوچھنے والے سہیل وڑائچ کی حالت ایسی تھی جیسے کسی دیہاتی کا ٹریکٹر کیچڑ میں پھنس گیا ہو!

''ملک صاحب کئی اسلامی چینل ملک میں دینی خدمات سر انجام دے رہے ہیں، کیا یہ کم ہے؟'' ایک مولانا نے لقمہ دیا۔

''کیا یہاں اور کیا وہاں پاکستان میں اس طرح کے اسلامی چینل سوائے فرقہ واریت کے اور کچھ بھی نہیں کر رہے ہیں؟ ایک دوسرے پہ الزام تراشی اور جنتی جنتی کا کھیل پہلے جو اپنی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد کے لاؤڈ سپیکر کے ذریعے ہوتا تھا، اب وہ اپنے اپنے ٹی وی چینل پہ ہو رہا ہے۔''

ملک ارشد بھی دھن کے پکے نکلے، سہیل وڑائچ سے ابھی کوئی مناسب جواب نہیں بن پا رہا تھا یا وہ مصلحتاً خاموش تھے، خدا جانے۔ مگر ان کی یہ خاموشی سوال کرنے والے کو بولنے کا موقع فراہم کر رہی تھی اور بولنے والا بولتا چلا جا رہا تھا۔

''آپ کے نیوز پرسنز، اینکرز اور رپورٹرز معاشرے کی برائیاں چن چن کے ٹی وی پر کارناموں کے طور پر پیش کرتے ہیں، اپنی عدالت قائم کر کے فیصلہ بھی سنا دیتے ہیں اور مارننگ شو کی میزبان، آپ کی بلورانیاں ایسی مطلق جاہل ہیں کہ جہاں صرف مسکرا دینا کافی ہو، وہاں ٹھٹھا لگا لیتی ہیں، سیٹی اور تالی بجا کر بریک ڈانسر کی ہمنوائی میں لگی ہوتی ہیں۔ انڈیا کے گانے تو مرچ مصالحے کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں، جن کے بغیر پروگرام کا ہر پکوان گویا پھیکا پھیکا رہ جاتا ہے۔۔۔''

''جی ملک صاحب! وقت کے دامن میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ آپ کے خیالات کے موتیوں کو بھی پرویا جا سکے، ہم وڑائچ صاحب کے ساتھ ایک خصوصی نشست رکھیں گے جس میں آپ جی بھر کے سوالات کیجئے گا۔''

آخر کار پروگرام کے میزبان کی حیثیت سے ہم نے پروگرام کے اختتام کا اعلان کر دیا یوں سب کی جان میں جان آئی۔

ارمان یوسف کا پشتنی تعلق مظفر گڑھ سے ہے لیکن سکونت برسہا برس سے لندن میں ہے۔ ارمان صاحب خوبصورت لب ولہجے کے شاعر اور ایک اچھے انشاء پرداز ہیں۔ مختلف رسائل وجرائد میں باقاعدگی کے ساتھ شائع ہو رہے ہیں۔ طنز ومزاح ان کا سلوب بیان ہے۔ ان کی اوّلین تصنیف ''لندن ایکسپریس'' ہے۔ یہ اُن کا سفرنامہ ہے جو ''ارمغانِ ابتسام'' میں بھی قسط وار شائع ہو رہا ہے۔ ''ارمغانِ ابتسام'' کے اوّلین کرم فرماؤں میں سے ہیں۔

بسری لڑی

آٹھواں عجوبہ

عنصر شبیر

چلتے ہو تو کے۔ٹو چلئے

سطح سمندر سے ۴۲۲۸،۶ فٹ بلندی پر واقع ''ایبٹ آباد'' اپنے معتدل موسم، تاحد نظر تک پھیلی ہریالی اور ''ملٹری اکیڈمی کاکول'' کی وجہ سے اپنی ایک خاص شہرت رکھتا ہے اور آج کل ایک نئی وجہ شہرت یہاں سے امریکہ کو سب سے زیادہ مطلوب شخص ''اسامہ بن لادن'' کے خلاف آپریشن ہے، جس نے اس شہر کو پوری دنیا میں روشناس کروادیا۔

پبلک سکولوں، خوبصورت اور کشادہ سڑکوں، دیدہ زیب پرائی اور جدید عمارتوں اور تاحد نظر دل موہ لینے والے ماحولیاتی محل وقوع کی وجہ سے اس کا شمار پاکستان کے خوبصورت ترین شہروں میں ہوتا ہے۔

ایبٹ آباد کی حدود میں جب ہم داخل ہوئے تو مساجد میں فجر کی آذانیں بلند ہونا شروع ہو چکی تھیں۔ اندھیرا ابھی گھپ اندھیرا ہی تھا، جس کی وجہ سے دُور پہاڑیوں پر موجود مکانوں میں جلتے بجلی کے قمقموں نے عجب سماں باندھ رکھا تھا، جیسے لاکھوں جگنو فضا میں ٹمٹما رہے ہوں۔

فضا میں عجب ساحرانہ سی تازگی اور خوشبو تھی، سڑک پہ چلتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ایک بہت بڑے پیالے میں لاتعداد جگنو چھوڑ دیئے گئے ہوں جو کہ خوشبو پھیلا رہے ہوں۔ جمالیاتی حسن کا یہ شاہکار منظر آپ کو ایبٹ آباد کے علاوہ ''مظفر آباد، کشمیر'' میں بھی نظر آئے گا مگر اُدھر فضا میں اتنی تازگی اور خوشبو میں نے کبھی نہ محسوس کی، جتنی ایبٹ آباد میں تھی۔

آپ ایبٹ آباد میں جائیں اور ''الیاسی مسجد'' نہ جائیں تو سمجھیں آپ نے یہاں آنے کا حق ادا نہیں کیا ہے۔ میں بھی سب سے پہلے ٹیوٹا وہیں لے گیا۔

مسجد کے اندر کہیں بلندی سے اُترتے کسی پہاڑی چشمے سے براہِ راست آتا ہوا تازہ اور صحت بخش پانی آپ کے اندر اترتی ساری تھکاوٹ کو کھینچ ڈالتا ہے، تر و تازہ کر دیتا ہے اور اگر اس پانی سے وضو بھی کر لیا جائے تو ایک رُوح بخش ٹھنڈک کا احساس جسم و جاں کے رگ و ریشہ میں اتر جاتا ہے۔ یہ پانچواں موقع ہے کہ الیاسی مسجد میں میں اپنے رب واحد القہار کے سامنے سجدہ ریز ہو رہا تھا۔ سکون اطمینان کا اک لمبا احساس میرے رگ و ریشہ میں اتر گیا۔ ساری رات کا جگراتا تھا، ایسا سکون ملا تو دنیا و مافیہا سے بے خبر مسجد کے اندر ہی عالم سرمستی میں ڈھیر ہو گیا۔

کوئی صبح کے چھ بجے ہوں گے کہ بابر نے آکر اٹھایا اور بڑی ہی مسکین صورت بنا کر بولا ''اٹھیں حضور والا، لاہور آ گیا ہے۔''
میں مسکرا کر، کسمسا کر بے دلی سے اٹھ بیٹھا۔

قریبی پہاڑیوں سے اُترتی ٹھنڈی ٹھنڈی تازہ خوشبودار ہوا میرے چہرے کو جب چھو کر گزرتی تھی تو میرے اندر ایک خمار سا اُترنے لگتا تھا۔ میں کسی میکدے سے لڑکھڑا کر نکلتے شرابی کی مانند بمشکل ٹیوٹا میں آکر بیٹھ گیا۔ میرے بیٹھتے ہی ٹیوٹا چل پڑا۔ گوجرانوالہ کے بندے کو بھوک لگ جائے تو پھر اس کو کچھ اور نہیں سوجھتا۔

''اوے بھلے مانسو! ناشتے کا منہ ہی دکھا دو، کھلا دو بے شک نہ۔''

''بادشاہ سلامت ناشتے کا وقت سو کر گزار چکے ہیں، دا تائیم گنجائش نشتہ، ناشتہ آپ کو گاڑی میں ہی کرنا ہوگا، ہم تو کر چکے۔''
بابر نے نمکین گرما گرم پراٹھا، چائے کا ابلتا ہوا لبالب بھرا کپ اور دو ابلے ہوئے انڈے میرے سامنے کر دیئے۔

ایبٹ آباد کی ٹھنڈی سڑک پہ رواں دواں اب ہم اس شہر کی طرف دوڑے چلے جا رہے ہیں جسے مغلیہ سلطنت کے مایا ناز سالار ''مان سنگھ'' نامی راجپوت نے آباد کیا تھا، اسی کی مناسبت سے ''وادیٔ چھتر لین'' کے اس افتتاحی دروازے کو ''مانسہرہ'' کہتے ہیں۔

''مانسہرہ'' ایبٹ آباد سے تقریباً پچیس کلومیٹر دور سرسبز شاداب پہاڑی راستہ ہے، جہاں ہم پہنچے تو زندگی کی چہل پہل عروج پہ تھی حالانکہ ابھی صرف ساڑھے چھ ہی ہوئے تھے۔ پہاڑی علاقوں کی صبح بھی بہت جلدی ہوتی ہے اور رات بھی بہت جلد، پررونق بازار، اور خوب گہما گہمی ہے۔

''بٹ گرام اور مانسہرہ'' کی تحصیلوں پر مشتمل ''ضلع مانسہرہ'' کا ایک قدیمی شہر ''مانسہرہ'' سے دائیں طرف ایک سڑک گھومتی ہے جو کہ شاہراہ ریشم سے ہٹ کر بالاکوٹ سے ہوتے ہوئے ''ملکۂ پربت'' کے دامن میں واقع ''جھیل سیف الملوک'' کی دیومالائی داستانوں کی وجہ سے مشہور خطۂ جنتِ ارضی'' کاغان، ناران'' کو جاتی ہے۔ اسی ''مانسہرہ'' سے ایک دوسرا راستہ ''گڑھی حبیب اللہ'' سے ہوتا ہوا آزاد کشمیر کے دارلحکومت ''مظفر آباد'' کو جاتا ہے۔۔۔ لیکن ساجنوں کی، ہم لوگوں نے تو سیدھا شاہراہ ریشم پہ جا چڑھنا ہے بھائی لوگو!

''مانسہرہ بائی پاس'' جیسے ہی ختم ہو، سڑک کے بائیں طرف دو بڑے بڑے پتھر ایک گنبد نما چھت کے نیچے آپ کو نظر آئیں گے، انہیں دو پتھروں پہ ''اشوک اعظم'' کے زمانے کی بدھ تعلیمات اور فرمودات آج بھی کندہ ہیں۔

ایسے ہی دو بڑے کتبے ''مانسہرہ'' سے کچھ فاصلے پر واقع ''بفہ'' کی طرف جاتے ہوئے راستے میں نظر آئیں گے، جسے مقامی لوگ ''غوری کے کتبے'' کا نام دیتے ہیں۔ سنسکرت زبان میں لکھے ہوئے یہ فرمان رواداری، محبت، امن اور پیار کا پیغام دیتے ہیں جو کہ کبھی ''بدھ مت'' کی تعلیمات کا خاصہ تھیں مگر آج بدھ مت کے پیروکار اپنی تعلیمات کو بھول کر نفرت، تعصب اور مارا ماری کے جنون میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ میانمار میں مسلمانوں کی سرعام باقاعدہ حکومت کی طرف سے نسل کشی اس کی بین اور تازہ ترین مثال ہے۔

قدم قدم پر پڑے قدیم تاریخ کے آثار اور نشانیوں کو بڑی تیزی سے پیچھے چھوڑتے ہوئے ہزارہ کے صنوبر کے جنگلات، سرسبز لش گرین میدانوں، تہہ در تہہ لہلہاتے کھیتوں سے ہوتے ہوئے ہم ۵،۸۱۰ فٹ بلند ''درۂ فرہاد'' کو عبور کر کے ''چھتر'' کے وسیع و عریض میدانوں میں ہم جا داخل ہوئے۔

''ہمالیہ'' کے دامن میں واقع ''چھتر'' کے اس میدان تک، سڑک پہاڑ کے گرد لپٹے ہوئے کسی بڑے سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی آگے ہی آگے چلی جا رہی تھی، یہاں پہنچ کر میں نے گل محمد کی زبان اور گاڑی کی اسپیڈ بہت کم ہوتے دیکھی۔ بے شمار چکردار موڑوں کی وجہ سے بہت تھکا دینے والی اس سڑک نے گل محمد کو بھی ریڈ الرٹ کر دیا تھا۔ اور تو اور، بابر بھی پچھلی سیٹ پہ الرٹ ہو چکا تھا۔

چائے کے باغات سے اَٹا یہ علاقہ اپنی ملکوتی حسن کے لحاظ

سے سوئیزر لینڈ کی کسی بھی خوبصورت ترین وادی سے کم نہیں، فرق صرف سہولتوں اور مقامی آبادیوں کے خلوص کا ہے۔ سوئیزر لینڈ میں سہولتیں زیادہ ہیں اور مقامی آبادی میں خلوص کم، جبکہ ''چھتر'' میں سہولتیں کم اور خلوص بہت زیادہ۔۔۔ حساب برابر۔

''مانسہرہ'' سے تہتر کلومیٹر کے فاصلے پہ وہ تاریخی قصبہ ہے جسے آج کل ''باٹا گرام''، گزرے کل میں ''بدھا گرام'' (بدھا کا گاؤں) اور پنجابی میں ''بٹ گرام'' کہتے ہیں۔

''بٹگرام'' کا بورڈ پڑھ کر پچھلی سیٹ سے بابر بولا ''بٹ صاحب! کتنی بے عزتی والی بات ہے کہ ادھر ''بٹوں'' کو گراموں میں تولا جاتا ہے اور ہمارے ہاں کے ''بٹ'' تو ٹنوں میں تولے جاتے ہیں، کیسے بٹ ہیں یہ!''

میں مسکرا کے بولا ''ہوسکتا ہے کہ یہاں کے ''بٹ'' ذرا بیمار شمار ہوں، تو اپنی فکر کر، پڑی ہوئی علتیں اور عادتیں جاتے جاتے ہی جاتی ہیں، تجھے نہ تول دیں؟''

بابر مسکرا کے بولا ''بٹ صاحب! عرض ہے کہ ''بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے۔''

''اوئے بے ادب! تمہارا مطلب ہے کہ ''بٹ'' بندے نہیں ہوتے؟''

بابر کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا ''میری زبان کٹ جائے جو میں ایسا کہوں، ہاں آپ خود ہی دھائی دینے لگیں تو بندۂ ناچیز کا کیا قصور؟''

ایک بھرپور قہقہہ ٹیوٹا میں گونج اٹھا۔

خیر بات ہو رہی تھی ''بٹ گرام'' کی اسی بٹ گرام سے چھبیس کلومیٹر دور ایک مقام آتا ہے، ''تھاکوٹ'' اس مقام پر دریائے سندھ پر مشہور اور جدید سائنس کا کمال ہے ایک ''جھومتا ہوا پل'' اس بغیر ستونوں کے پل سے ایک وقت میں ستر ٹن وزن باآسانی گزارا جاسکتا ہے۔

اس پل کی دیگر سات عدد اور بھی خوبیاں ہیں۔

۱) یہ پل دنیا کے ''آٹھویں عجوبہ'' شاہراہ ریشم پہ واقع ہے۔

۲) ''شاہراہ ریشم'' کا افتتاح اسی مقام پر کیا گیا تھا۔

۳) پل کے مغربی حصہ سے ''پیر سر'' کی چوٹی واضح ہے جسے یہاں سے واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔

۴) یہ ''پیر سر'' کی چوٹی وہی تاریخی جگہ ہے، وہی آخری مقام ہے دریائے سندھ کے مغرب میں، جہاں تک ''سکندر اعظم'' نے برصغیر میں مہم جوئی کی تھی۔

۵) ''تھاکوٹ'' ہی سے ایک راستہ پرانی ''امب'' ریاست کے قدیم قصبہ ''دربند'' کو جاتا ہے۔

۶) اور دربند ہی وہ مقام ہے جہاں سے دریائے سندھ ''پنجاب'' کی سرحد میں داخل ہوتا ہے۔

۷) آج کل اسی ''دربند'' قصبہ کو ''تھاکوٹ'' سے ''ہری پور'' بذریعہ سڑک ملا دیا گیا ہے۔

اور میں اس وقت اسی تھاکوٹ کے، اسی جھومتے پل پہ، ٹیوٹا میں سے نکل کر، پل کے عین درمیان میں کھڑے ہوکر، اسی ''پیر سر'' کی چوٹی کا نظارہ کر رہا تھا۔

میرے پاؤں کے نیچے گاڑیوں کے گزرنے سے پل یوں جھومتا تھا جیسے کوئی جھولا ہلکارے لیتا ہو اور اس پل کے نیچے سے انتہائی تیز رفتار پانی کسی شیر کی طرح دھاڑتے ہوئے گزرتے ہی چلا جا رہا تھا۔

لگے ہاتھوں، کیوں نہ بات کو آگے چلانے سے پہلے ذرا شاہراہ ریشم کی بات بھی ہوجائے۔

ہم ''شاہراہ ریشم'' کو بغیر کسی لگی لپٹی کے دنیا کا آٹھواں عجوبہ کہہ سکتے ہیں۔ یہ شروع تو ''حویلیاں'' ہی سے ہو جاتی ہے مگر تھاکوٹ تک یہ ایک عام سی یک رویہ سڑک ہے، تھاکوٹ کے مقام پر دریائے سندھ کے اوپر بنایا گیا ''جھومتا پل'' کراس کر کے، دریا عبور کر کے، سڑک دریا کے دائیں طرف اور پہاڑ آپ کے بائیں طرف ہو جاتے ہیں۔ یہی وہ جگہ ہے، جہاں سے شاہراۂ ریشم کا عجوبہ پن دکھنا شروع ہو جاتا ہے، جو کہ ''خنجراب ٹاپ'' تک قائم رہتا ہے۔

تحیر سے سٹی گم کر دینے والے مناظر انسانی عقل وہنر کی معراج، فنِ تعمیر کے ایسے ایسے کمالات دیکھنے کو ملتے ہیں کہ انسان

انگشت بدانداں رہ جاتا ہے۔

''شاہراہ ریشم'' کی تعمیر سے قبل یہ سڑک ''انڈس ویلی روڈ'' کے نام سے جانی پہچانی جاتی تھی ، بلکہ ''بشام'' سے ''چلاس'' اور ''چلاس'' سے ''گلگت'' تک کا سفر آ ک جیپ ٹریک تھا اور ''چلاس'' ہی سے ایک راستہ ''بابوسر ٹاپ'' کو کراس کر کے ایک جیپ ٹریک کے ذریعے ٹھاہ کر کے ''وادیٔ کاغان'' کے گلے سے مل جاتا ہے۔

سنگلاخ پہاڑوں، پتھریلی چٹانوں کے باعث یہ راستہ انتہائی دشوار گزار، خطرناک ہونے کے علاوہ انتہائی لمبا اور تھکا دینے والا ہے۔ سردیوں کے پانچ ماہ تو یہ علاقہ دنیا سے مکمل طور پر اور دو ماہ جزوی طور پر کٹ جاتا تھا، صرف گرمی کے پانچ ماہ ہی اس علاقے میں آمد و رفت ممکن ہے۔

۱۹۶۲ء کی ''چین۔ بھارت جنگ'' اور اس کے بعد ہونے والی ۱۹۶۵ء کی ''پاک۔ بھارت'' جنگ نے چین اور پاکستان کو مشترکہ دشمن کے خلاف بہت کچھ سوچنے پہ مجبور کر دیا۔ ''دفاعی'' نقطۂ نگاہ سے شروع کیے گئے اس عظیم الشان منصوبہ پر وقت کے ساتھ ساتھ ''تجارتی رنگ'' زیادہ حاوی ہونے لگا ہے۔ پس ۱۹۶۶ء میں پاکستان اور چین کی حکومت کے درمیان ابتدائی معاہدہ ہوا۔ شاہراہ ریشم کا ابتدائی تخمینہ ۵۱۴.۲۱۸ ملین روپے لگایا گیا تھا لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ ۱۹۷۸ء میں جب یہ منصوبہ مکمل ہوا تو ۳۱۴۱.۶ ملین روپے لاگت آچکی تھی، جس کی دو بڑی وجوہات تھیں۔

۱) یہ کہ یہ منصوبہ ۱۹۷۱ء کی پاک۔ بھارت جنگ اور اس کے بعد کے سیاسی حالات کی وجہ سے بار بار التواء کا شکار ہوا۔

۲) دوسری بڑی وجہ توقع سے کئی گنا زیادہ مشکلات اور رکاوٹیں سامنے آتی رہیں۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس منصوبہ کی تکمیل کے دن تک ۱۷۱۸ قیمتی جانیں اس منصوبہ پر قربان ہو چکی تھیں۔

انہیں مشکلات کو دیکھتے ہوئے ''لیفٹیننٹ جنرل، چیف آف جنرل سٹاف ''یعقوب علی خاں'' نے جو کہ بعد میں گورنر مشرقی پاکستان بھی رہے اور لمبی مدت تک پاکستان کے وزیرِ خارجہ بھی رہے، نے ایک موقع پر ''پھسو'' کے مقام پہ آرمی کے جوانوں کا

حوصلہ بڑھاتے ہوئے یہ تاریخی الفاظ کہے تھے۔

''مجھے فخر ہے آپ پر، آپ کے بچے اور پھر اُن کے بچے آپ کو ہمیشہ یاد رکھیں گے۔ آپ آرمی کی تاریخ کا سب سے بڑا کارنامہ انجام دے رہے ہیں۔ یقیناً تاریخ چند لوگ ہی بناتے ہیں۔''

''شاہراہ ریشم'' کا محلِ وقوع بھی بہت مشکل اور دشوار گزار ہے۔ اگر شمال میں ''پامیر'' کی عظیم سطح مرتفع ہے تو شمال مشرق میں ''قراقرم'' کے بلند و بالا پہاڑ ہیں۔ مغرب میں عظیم ''ہمالیہ'' ہے تو جنوب مغرب کی طرف ''کوہ ہندوکش'' سر اٹھائے کھڑا ہے۔

اس سارے علاقہ میں ۲۴۰۰۰ فٹ سے بلند ۳۳ فلک بوس، برف پوش چوٹیاں یخ بستہ سفید چادر اوڑھے آپ کی نظر کو سکون بخشنے کے لئے ہمہ وقت منتظر رہتی ہیں۔

مون سون ہواؤں کی پہنچ سے دور ہونے کی وجہ سے یہ علاقہ زیادہ تر خشک اور چٹیل ہے۔

دوسری طرف دیکھیں تو ''پولر ریجن'' کے بعد یہ علاقے دنیا کے نامور اور بڑے بڑے گلیشیرز کی آماجگاہ ہیں۔

۱) دنیا کا سب سے بلند ''میدانِ جنگ'' سیاہ چین گلیشیر (لمبائی ۷۵ کلومیٹر)

کے علاوہ

۲) ''بیافو'' (لمبائی ۵۸ کلومیٹر)

۳) ''ہیسپر'' (لمبائی ۵۳ کلومیٹر)

۴) ''بالتورو'' (لمبائی ۶۲ کلومیٹر)

کی سرزمین بھی یہی علاقہ ہے۔

۱۸ رجون ۱۹۷۸ء کو اس وقت کے صدرِ پاکستان'' جنرل ضیاء الحق مرحوم'' اور چین کے نائب وزیر اعظم عزت مآب'' گنگ بیاؤ'' کے ہاتھوں ''تھاکوٹ'' کے مقام پر ہونے والے افتتاح کے بعد اس شاہراہ کو ''شاہراہِ دوستی'' کا نام دے دیا گیا۔

سدا بہار ہر موسم و حالات میں قائم رہنے والے دوستی کی طرح یہ شاہراہ بھی ہر قسم کے موسم کے مطابق ڈیزائین کی گئی ہے۔

آٹھ سو سولہ (۸۱۶) کلومیٹر طویل یہ سڑک سارا سال اپنے اوپر ہر قسم کی ٹریفک کا لوڈ برداشت کرنے کی اہلیت رکھتی ہے۔

شاہراہ ریشم علامت ہے اس کے بنانے والوں کی ہمت، بہادری اور حوصلے کی، جنہیں ان ہیبت ناک پہاڑوں کی ہیبتنا کی، دشواری اور مشکلات ڈرا نہ سکیں۔ حصولِ مقصد سے ہٹا نہ سکیں۔ بہادر ماؤں کے یہ مایۂ ناز، جری سپوت اپنے پسینے اور لہو سے ہمت اور حوصلے کی ایسی داستاں رقم کر گئے جو رہتی دنیا تک قائم رہے گی۔

اس سڑک پہ چلنے والا ہر فرد اُن قابلِ فخر سپوتوں کی لازوال ہمت اور حوصلے کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکتا۔

ہر ایک کلومیٹر پر ایک انسانی جان کا نذرانہ وصول کرنے والی اس سڑک پر قربانیوں کا لازوال سلسلہ اب بھی جاری و ساری ہے۔ اس کی مرمت اور دیکھ بھال کرنے والے اپنے سے پہلوؤں سے کسی طور بھی کم نہیں ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ انسانی خون کے اس بلیدان نے ہی انسان کو ترقی کی معراج تک پہنچایا ہے۔

اللہ اس شاہراہِ دوستی کو تا قیامت قائم و دائم رکھے۔ آمین۔

(جاری ہے)

عنصر شبیر صاحب کا تعلق پنجاب کے شہر ''گوجرانوالہ'' سے ہے چنانچہ اسی نسبت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے وہ بقلم خود بھی عہد جوانی میں چھوٹے موٹے پہلوان رہ چکے ہیں۔ ایم اے اکنامکس، ایم اے اردو کر چکے ہیں۔ پیدائی کھلاڑی ہوئے ہیں۔ قومی سطح تک فٹبال کھیلے اور کوہ پیائی کی۔ شمالی علاقہ جات کی مختلف مقامات کی ہائیک کر چکے ہیں۔ ۱۹۹۶ء میں ''کے ٹو'' بیس کیمپ پر پہنچے اور وہاں سے ''گوندو گورو لا گلیشیر'' سر کیا، تب تک چند ایک پاکستانیوں نے ہی اس درے کو عبور کیا تھا۔ مختلف ادبی تنظیموں کے رکن ہیں۔ من موجی قلمکار ہیں، تین عدد سفرنامے لکھ چکے ہیں اور جب جی چاہے چھوٹا موٹا کالم بھی لکھ مارتے ہیں۔

سرکا پہلوان اور دلدار بھٹی

دوپہر کے وقت آنکھ کھلتے ہی ہم نے سفرنامہ مکمل کرنا شروع کردیا، کچھ دیر بعد سرکا پہلوان کی جانب سے ایس ایم ایس کے ذریعے پاک ٹی ہاؤس میں افطارڈنر کی دعوت موصول ہوئی تو ہم نے لکھنا موخر کر کے تیار ہونا شروع کردیا ایک گھنٹے بعد لفٹ کے ذریعے عمارت سے باہر نکل کر آسمان کی طرف دیکھا تو موسم قدرے خوشگوار پایا، ایمپریس روڈ پر اکا دکا گاڑی آجا رہی تھی ہم شملہ پہاڑی چوک پار کر کے پریس کلب میں داخل ہوئے تو صحن کے وسط میں بابائے مانیٹرنگ بیٹھے ہوئے مل گئے ہم نے ان سے خیریت دریافت کی ”کیا حال چال ہے؟“

بیزاری سے دونوں ہاتھ اٹھا کر بولے ”بس یار اب تو چل چلاؤ ہے۔۔۔!“

ہم نے ان کا کندھا تھپتھپا کر کہا ”آپ تو بڑے حوصلے والے تھے پھر یوں دل کیوں چھوڑ بیٹھے ہیں؟“

انہوں نے ایک سرد آہ بھر کر نثار اکبرآبادی کے دو اشعار پڑھ دیئے۔

زندگانی کے مزے جاتے رہے
سب زباں کے ذائقے جاتے رہے
وقت کے ہاتھوں نے کی یوں لوٹ مار
حوصلے اور ولولے جاتے رہے

ہم نے جواب میں غالب کا شعر ذرا سی ترمیم کے ساتھ پڑھ دیا۔

مارا زمانے نے راؤ طارق کامران تجھے
وہ ولولے کہاں، وہ جوانی کدھر گئی؟

بابائے مانیٹرنگ نے زوردار قہقہہ لگایا اور ہم استقبالیہ کی جانب بڑھ گئے، دروازے کے برابر والے بینچ پر نیم بزرگ صحافی بیٹھے گا رہے تھے۔

صحافتی دنیا میں دل لگتا نہیں واپس بلالے
میں صحن میں پڑا ہوں اے مالک اٹھالے

ہم نے ان کا شانہ ہلا کر پوچھا ”آپ صحافت سے اتنے دلبرداشتہ کیوں ہوگئے ہیں؟“

نگاہیں جھکا کر گلوگیر آواز میں بولے ”تین ماہ سے تنخواہ نہیں ملی!“

ہمیں دھچکا سا لگا اور بے بسی سے آگے بڑھ گئے لائبریری میں پہنچے تو وہاں حسب معمول سیاسی بحث و مباحثہ جاری تھا بیشتر سینئر صحافی ”تبدیلی“ پر کڑی تنقید کر رہے تھے البتہ چند جواں سالہ صحافی اب بھی پر امید تھے۔ اس ماحول میں اخبارات بالخصوص کالموں کا مطالعہ بیحد مشکل کام تھا، لہٰذا ہم دو تین اخبارات کی شہ سرخیوں پر سرسری نگاہ ڈال کر اٹھ گئے اور پارکنگ سے موٹر بائیک نکال کر پریس کلب سے نکل کھڑے ہوئے۔ پاک ٹی ہاؤس پہنچے تو سرکا پہلوان کی میز آباد ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر خبیث شیطانی، علامہ توحیدی، کامریڈ جمشید، وحید اختر اور چراغ اندھیروی کے علاوہ چھیدا بونگا

بھی موجود تھا۔ ہم بھی علیک سلیک کر کے بیٹھ گئے سرکا پہلوان نے چراغ اندھیروی سے فرمائش کی ''یار کوئی نظم ای سناؤ!''

وہ انکساری سے کہنے لگے ''میں بھلا کہاں کا شاعر ہوں، بس اپنے اردگرد کے ماحول میں جو کچھ دیکھتا ہوں اسے ٹوٹے پھوٹے شعروں میں ڈھال دیتا ہوں۔۔۔!''

چھیدا بونگا فوراً بول اٹھا ''گویا بقول جگن ناتھ آزاد ؎

شعر کے فن سے تو ہوں آزاد بیگانہ مگر
صفحۂ کاغذ پہ لکھ دیتا ہوں جو سنتا ہوں میں

ہم منہ پھیر کر مسکرانے لگے چراغ اندھیروی چھیدے بونگے کو گھورتے ہوئے اٹھ کر دوسری میز کی طرف بڑھے، تاہم سرکا پہلوان نے انہیں واپس بلا لیا، ہم نے کہا'' جگن ناتھ آزاد نے دریائے راوی پر بھی نظم کہی تھی۔''

ڈاکٹر خبیث شیطانی کہنے لگے'' جگن ناتھ آزاد کے والد بھی غالباً ادیب یا شاعر تھے!''

''ماسٹر تلک چند محروم۔۔۔!'' ہم نے اثبات میں سر ہلا کر تائید و تصدیق کی۔

علامہ توحیدی نے حیرت سے کہا'' تلک چند تو ہندوؤں کا نام ہے یہ مرحوم کیسے ہو گئے انہیں آنجہانی کہنا چاہیے!''

ہم نے بھنا کر کہا'' مرحوم نہیں محروم۔۔۔ یہ ان کا تخلص تھا!''

اسی وقت این جی او کا کارکن پاک ٹی ہاؤس میں داخل ہوا اور ہماری میز کے قریب رک کر وحید اختر سے پوچھنے لگا ''آپ سوشل میڈیا پر کون سی زبان استعمال کرتے ہیں؟''

وحید اختر بولے'' میں نے سوشل میڈیا کا تازہ تازہ استعمال شروع کیا ہے اور اس پر ٹیکنالوجی کی زبان یعنی انگریزی کو ذریعہ اظہار بناتا ہوں!''

این جی او کے نوجوان نے ہماری طرف دیکھا تو ہم نے بتایا '' میں تو زیادہ تر قومی زبان یعنی اردو استعمال کرتا ہوں، کبھی کبھار مادری زبان بھی استعمال کر لیتا ہوں!''

نوجوان نے سرکا پہلوان سے سوال کیا تو انہوں نے مختصر جواب دیا'' ماتری بولی۔۔۔ پنجابی!''

ڈاکٹر خبیث شیطانی کہنے لگے ''سوشل میڈیا پر ہمیں آپس میں قومی اور مقامی یعنی مادری زبانیں ہی استعمال کرنی چاہئیں لیکن زیادہ تر لوگ حتیٰ کہ اردو کے معروف ادیب، شاعر اور صحافی کالم نگار دانشور بھی آپس میں قومی یا مادری زبان کے بجائے پدری زبان استعمال کرتے ہیں!''

''پدری زبان۔۔۔؟'' سب نے حیرت سے پوچھا

سرکا پہلوان برا سا منہ بنا کر بولے'' کالے انگریز اج وی انگریزی نوں'' مائی باپ'' دی بولی سمجھدے نیں!''

اس پر محفل میں قہقہے بلند ہوئے اور اردگرد کی میزوں پر بیٹھے ہوئے دانشور ناگواری سے ہمیں گھورنے لگے وحید اختر کا موڈ آف ہو گیا، این جی او کا کارکن دوسری میزوں کی طرف بڑھ گیا اور باہر سے آنے والا جواں سالہ شاعر شیراز دخانی ہماری میز کے قریب رک کر کہنے لگا'' یار و مجھے سگریٹ ہی پلا دو۔۔۔!''

سرکا پہلوان دھاڑ کر بولے ''اوئے روزے رکھیا کر بے شرما۔۔۔!''

وہ سر جھٹک کر کہنے لگا ''میں دنیا کو مسافر خانہ اور زندگی کو طویل سفر سمجھتا ہوں اور آپ لوگ جانتے ہی ہیں کہ سفر میں روزہ معاف ہوتا ہے!''

''لاحول ولاقوۃ الا باللہ!'' علامہ توحیدی نے زور سے لاحول پڑھی تو شیراز دخانی جلدی سے آگے بڑھ گیا، ویٹر نے میز پر افطاری کا سامان لگانا شروع کر دیا، گیلری کی سیڑھیاں اتر کر آنے والے شاعر دلدار پریمی ہمارے پاس رک گئے ان کی خمار آلود آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے لگتا تھا چند روز سے

سوشل میڈیا پر ہمیں آپس میں قومی اور مقامی یعنی مادری زبانیں ہی استعمال کرنی چاہئیں لیکن زیادہ تر لوگ حتیٰ کہ اردو کے معروف ادیب، شاعر اور صحافی کالم نگار دانشور بھی آپس میں قومی یا مادری زبان کے بجائے پدری زبان استعمال کرتے ہیں!

مسلسل جاگ رہے ہیں ہم نے انہیں کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا مگر وہ دسترخوان کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے سرکا پہلوان سے کہنے لگے" کیا آپ دنیا میں صرف کھانے پینے کیلئے آئے ہوئے ہیں؟"

سرکا پہلوان دھاڑ کر بولے "اوئے جاتے جاکے اپنی نیندر پوری کر!"

دلدار پرویز بھٹی فلمی گیت گنگناتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

میری آنکھوں میں بس گیا کوئی رے
موہے نیند نہ آئے میں کیا کروں؟
میری آنکھوں میں۔۔۔

وحید اختر ہم سے پوچھنے لگے "لاہور میں لوہاری اور دلی دروازہ پایا جاتا ہے کیا دہلی میں بھی لاہوری اور دلی دروازہ موجود ہے؟"

ہم نے کامریڈ جمشید کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "میں بھی آپ کی پنجابی ہوں اور آج تک دلی شہر نہیں دیکھا البتہ یہ آپ کو بتاسکیں گے کیونکہ اہل زباں خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جو تقسیم ہند کے وقت دلی سے ہی ہجرت کرکے لاہور آیا تھا!"

وحید اختر نے اپنا سوال کامریڈ جمشید کے سامنے دہرایا تو وہ ان سے کہنے لگے ""یہ تو میں تمہیں نہیں بتاسکتا۔۔۔!"

وحید اختر جلدی سے ہماری طرف مڑکر بولے "یار آپ تو کہتے تھے اہل زباں ہیں مگر مجھے تو یہ بدزباں لگتے ہیں!"

سب کھلکھلا کر ہنس پڑے، ہم نے ہنسی پر قابو پاتے ہوئے وضاحت کی "یہ اہل زباں ہی ہیں بس کچھ عرصہ سے کنٹینر پارٹی کے حامی ہوچکے ہیں!"

کامریڈ جمشید جھلا کر کہنے لگے ""یار یہ بات میں تمہیں بتا ہی نہیں سکتا کیونکہ دلی سے میرے والدین آئے تھے میں تو پیدا ہی لاہور میں ہوا تھا اور۔۔۔!"

سرکا پہلوان ہاتھ اٹھا کر پوچھنے لگے "تینوں پنجابی تے آندی ہوئی اے؟"

لاپرواہی سے کندھے جھٹک کر بولے "سمجھ تو لیتا ہوں مگر بول نہیں سکتا!"

چھیدے بونگے نے کہا "یہ کیوں نہیں کہتے کہ پنجابی بولنا ہی نہیں چاہتے!"

کامریڈ جمشید خاموشی سے چھیدے بونگے کو گھورنے لگے۔

اچانک سرکا پہلوان کے محلے دار خواجہ دلاور امرتسری پاک ٹی ہاؤس میں داخل ہوئے اور ہیلمٹ کو میز پر پٹختے ہوئے کہنے لگے "یار اس ہیلمٹ نے تو میری زندگی عذاب بنا کر رکھ دی ہے، بلڈ پریشر اور دمے کا مریض ہوں، شدید گرمی میں چالان سے بچنے کیلئے موٹر سائیکل چلاتے ہوئے ہیلمٹ پہنتا ہوں تو میری جان پر بن جاتی ہے!"

"موٹر سائیکل بیچ کر سائیکل ہی خرید لیں!" ڈاکٹر خبیث شیطانی نے انہیں مشورہ دیا۔

"پٹرول بھی بہت مہنگا کردیا گیا ہے!" ہم نے لقمہ دیا۔

وحید اختر کہنے لگے "ڈالر بھی اوپر سے اوپر جارہا ہے!"

دلاور امرتسری بڑبڑائے "ایسی تبدیلی کا تو کبھی سوچا بھی نہ تھا!"

سرکا پہلوان کہنے لگے "یار حکومتی سیاست دے اناڑی کھلاڑی کولوں ہور کیہ امید رکھی جاسکدی سی!"

اسی وقت روزہ افطار ہونے کا اعلان ہوگیا اور پاک ٹی ہاؤس کے ہال میں تمام میزوں پر سناٹا چھا گیا صرف برتن کھنکنے کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔

میم سین بٹ یا محمد سرفراز بٹ صاحب کا تعلق صحافت سے ہے۔ مختلف اخبارات سے وابستہ رہے ہیں۔ آج کل روزنامہ "خبریں" کے نیوز روم سے منسلک ہیں، اس کے ادارتی صفحے پر کالم اور سنڈے میگزین میں مضامین لکھتے ہیں۔ بٹ صاحب نے لاہور کی تاریخ پر ایک کتاب بھی لکھی ہے۔ ان کے بیشتر کالموں میں لاہور سانس لیتا ہوا نظر آتا ہے۔ "ارمغانِ ابتسام" پر روزِ اوّل سے خصوصی کرم فرما رہے ہیں۔

گھر داماد سے جنگلی شیف تک

مزاح مت
کے ایم خالد
kmkhalidphd@yahoo.com

کوئی دور تھا کہ گھروں میں کھانا اکثر شوہر حضرات بنا تو لیتے تھے مگر ''زن مریدی'' کے الزام کے خوف سے اس کھانے کا کریڈٹ بھی اپنی زوجہ محترمہ کے کھاتے میں ڈال دیتے تھے۔ اس کام میں زیادہ طاق گھر داماد حضرات تھے کیونکہ انہیں سسرال میں سب کو خوش رکھنا پڑتا تھا۔ پھر یوں ہوا کہ زمانے کی ہوا ہی بدل گئی کوئی گھر داماد شریف نامی باورچی ''شیف'' کے نک نیم سے مارکیٹ میں چھاتا چلا گیا اور یوں سارے ان مردوں پر ایک نئی دنیا آشکار ہوئی جو اس سے پہلے بیگم کے نام پر برسوں کھانے بناتے بوڑھے ہو چلے تھے اپنے اصل نام اور کام کے ساتھ خاندان میں ''شیف'' کے نام سے جگہ بناتے چلے گئے۔

انسان کسی بھی فیلڈ میں ہو اس کے اندر ایک اداکار، گلوکار ضرور چھپا ہوتا ہے حتیٰ کہ میڈیا کے خشک ترین شعبے نیوز اور حالات حاضرہ بھی اس سے قطعاً محفوظ نہیں۔ اس میں زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں صرف چند لمحے آنکھیں موندیں میڈیا کی تقریباً ہر چینل چکھنے والی ایک ہمہ جہت شخصیت ''ڈاکٹر'' فوراً آپ کی آنکھوں کے سامنے مسکراتے ''آم کھائے گا آم'' کہتے آموجود ہوگی۔ یہ ایسی شخصیت ہیں جن میں نہ صرف میڈیا کے تمام سیکشن بلکہ بونس میں فلم بھی، کہانی سے لے کر اداکاری، گلوکاری، ہدایتکاری غرض فلم کے جو بھی لوازمات ہیں وہ ان سب پر اپنے تئیں پورے اترتے ہیں۔ ''ڈاکٹر'' صاحب کے پاس کچھ کھانوں کی ریسپی بھی ہیں جن کو وہ عموماً رمضان المبارک کے دوران ہی دھرانا تو پسند فرماتے ہیں لیکن انہیں اپنی ریسپی سے بنے ہوئے کھانے کو چکھتے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔

سیٹلائٹ کوکنگ چینلز میں کیا خاتون اور کیا ہی کوئی مرد شیف آپ کو کھانے کے دوران اپنی اداکاری کے نام پر اپنی دل چسپ حرکات سے زبردستی لطف اندوز کروانے کی کوشش میں مصروف عمل نظر آئے گا اس میں زیادہ تر شیف گلزار تو ''ڈاکٹر'' عامر لیاقت کی طرح اپنی عجیب وغریب حرکات کو بھی اداکاری ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں اور اس کا کریڈٹ بھی ناظرین سے لینا چاہتے ہیں لیکن اگر چینلز کی اندھی دوڑ کو دیکھا

> ابھی تک تو یوٹیوب پر دکھائی جانے والی ککنگ وڈیوز میں جنگل اور سمندر کا ماحول اور جنگلی اسٹائل میں شکار پکانا دکھایا جا رہا ہے اور شائد سنسر کی پالیسیوں کا خیال رکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے لیکن بابا جی کا فرمانا ہے ''پتر ''کلک'' کی دوڑ ان شکار کی ککنگ وڈیوز بنانے والے شوقین حضرات کو کہیں ازمنہ قدیم دور کے اصل جنگل اور اسٹائل میں نہ لے جائے''۔

جائے تو شائد یہ سب کچھ شیف نہیں بلکہ پروڈیوسر اور پروڈیوسر سے بھی بڑھ کر چینل انتظامیہ کی ریٹنگ ڈیمانڈ ہو گی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ کسی سیٹلائٹ چینل کو شروع کرنا اربوں روپے کا مسلسل کام ہے جسے یوٹیوب نے ''کچھ دو کچھ لو'' کی پالیسی کے تحت پوری دنیا سے تعلق رکھنے والے ہر ذوق کی پروڈکٹس کے لئے فری اوپن کر دیا ہے۔ یوٹیوب پر دوسری پروڈکشن کے ساتھ ساتھ ککنگ چینلز کی ایک نئی ''کلک'' کی دوڑ شروع ہو چکی ہے ہر وہ شخص جسے صرف دلیہ ہی بنانا آتا ہے وہ بھی ''شیف گلزار'' بنا ہوا ہے عجیب و غریب علاقوں کے نام پر عجیب و غریب کھانے بنائے جا رہے ہیں۔ یوٹیوب چینل پر وڈیوز اپ لوڈ اور ''کلک'' سے کمائی سمیٹنے کے لئے بہت سے ملکوں نے اپنے شہروں کے قریب ہی اپنے ہی ''جنگل اور سمندر'' آباد کر لئے ہیں جہاں حسین و جمیل تازہ میک اپ زدہ خواتین ''سمندر'' سے مچھلیاں پکڑتی اور بھوک سے اپنے پیٹوں پر ہاتھ پھیرتے ''جنگلی'' چھوٹے بچے ''جنگلی شیف'' کے بہروپ میں دنیا کے جدید ترین کیمروں کے سامنے اداکاری کی آخیر کرتے ہوئے شکار کو پکڑنے اور پکانے کے لئے بے تاب نظر آتے ہیں اور حیرت کی بات وہ شکار کرنے اور پکانے میں بھی بہت جلد کامیاب ہو جاتے ہیں۔ انہیں شکار پکڑنے اور پکانے کے دنیا سے درآمد شدہ لوازمات پہلے سے ہی دستیاب ہیں۔

جیسے یوٹیوب کے خود ساختہ ''جنگلی شیف'' کے پکوان چینل پیسوں کی دوڑ میں کام یاب ہوتے دکھائے دے رہے ہیں، اب پاکستان کے سٹلائٹ ککنگ چینلز سے یہ بھی بعید نہیں کہ وہ بھی اپنے اپنے شیف دنیا سے دور افتادہ جنگلوں میں اُتار دیں اور وہیں سے لائیو ککنگ کے پروگرام آن ائیر کریں اور پاکستان کے ککنگ شوز کے شوقین ناظرین شیف گلزار کو کیلوں کے پتوں کا تہبند لگائے کمر پر مور کے پروں کے رنگ برنگے پنکھ لگائے اور سر پر جنگلی پھولوں کا تاج پہنے جنگل میں کسی شتر مرغ کے پیچھے پہلے گھنٹوں بھاگنے خوار ہونے کے بعد اس کا بڑی مشکل سے شکار کرنے کے بعد شتر مرغ کی بھاری بھرکم یخنی بنانے کی لائیو ریسپی دیکھیں۔ اس شکار کے دوران شیف گلزار پر ایک دو گانے بھی پکچرائز کے جا سکتے ہیں اس کے لئے جنگل سے کسی خوبصورت سی ہیروئن کو ''اچانک'' بھی دریافت کیا جا سکتا ہے۔ اس لمبے فلم نما ککنگ شو کی بدولت شیف گلزار کی زندگی میں رہ جانے والی فلمی اداکاری کی کمی کو کما حقہ پورا کیا جا سکتا ہے۔ شیف گلزار کے علاوہ ککنگ چینل کی شیف آنٹیاں جنگل میں پھرتے پھراتے اچانک ہی جنگل میں موجود ''قبیلے'' کے لوگوں کے ہاتھوں گرفتار ہو کر یرغمال بنیں اور پھر کچا کھانے والے ''قبیلے'' کے باسیوں کو اپنے ''مشہور زمانہ چینلز پر پیش کئے جانے والے مزیدار'' قسم کے کھانوں کو بنا کر کھلائیں۔ اس عمل سے وہ جنگلی لوگ نہ صرف شیف آنٹیوں کو آزاد کر دیں بلکہ ان سے کھانا بنانا بھی سیکھیں گے جسے ''سوپ ڈراموں'' کی طرح سینکڑوں قسطوں تک طوالت دی جا سکتی ہے۔ اس سے ان ککنگ پروگرام کی ریٹینگ میں تو خاطر خواہ اضافہ تو ہوگا ہی چینل کا گراف بھی دوسرے چینلز کے مقابلے میں بلند ہوگا۔

ابھی تک تو یوٹیوب پر دکھائی جانے والی ککنگ ویڈیوز میں جنگل اور سمندر کا ماحول اور جنگلی اسٹائل میں شکار پکانا دکھایا جا رہا ہے اور شائد سنسر کی پالیسیوں کا خیال رکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے لیکن بابا جی کا فرمانا ہے ''پتر'' کلک'' کی دوڑ ان شکار کی ککنگ وڈیوز بنانے والے شوقین حضرات کو کہیں از منہ قدیم دور کے اصل جنگل اور اسٹائل میں نہ لے جائے''۔

کے ایم خالد صاحب راولپنڈی میں مقیم ہیں۔ موصوف عرصۂ دراز سے لکھ رہے ہیں۔ اب تک ہزاروں کی تعداد میں مضامین، کالم اور ڈرامے لکھ چکے ہیں۔ ٹی وی کے بہت سے چینلوں پر ان کے ڈرامے پیش کئے جا رہے ہیں۔ ان دنوں ''مزا۔مت'' کے عنوان سے ایک اخبار میں کالم بھی لکھ رہے ہیں۔ خالد صاحب کے اسلوبِ بیان اول تا آخر فکاہی ہے۔ ان کے ہاں طنز کی بے مثال چاشنی پائی جاتی ہے۔ ان کی مختصر کہانیاں خاصے کی چیز ہیں۔ ''ارمغانِ ابتسام'' کی مجلسِ مشاورت میں شامل ہیں اور یہاں کی رونقوں میں ان کا بھی خاصا ہاتھ ہے۔

مزاحیہ

کبڑے کا جشمہ

م۔ص۔ایمن

ہم بیمار ہوتے ہیں دوا کھاتے یا پیتے ہیں تو اس کا نام انگریزی زبان میں ہوتا ہے۔گولی کو گول کر بچوں کو پلاتے ہیں اس پر انگریزی لکھی ہوتی ہے، گویا انگریز نے اپنی انگریزی ہماری رگ رگ میں اتار دی ہے......ہم چاہیں بھی تو اس انگریزی سے جان نہیں چھڑا سکتے۔ انگریز نے سو سال برصغیر پر حکومت کی اسے گئے ہوئے بھی ستر سال ہو گئے۔کبھی کبھی میرے دل میں خیال آتا ہے کہ اگر انگریز برصغیر میں پنجہ رنجہ نہ فرماتا تو ہماری زبان اردو پھر بھی ایسی ہوتی؟

اب صورت حال یہ ہے کہ میں کسی عام سی پرچون کی دکان پر جاؤں۔دیکھوں کہ دکان دار شکل سے ہی ان پڑھ نظر آ رہا ہے۔سوچوں کہ یہ انگریزی تو کیا اردو بھی شاید ہی جانتا ہو۔میں اسے کہوں کہ مجھے 'سات اوپر' دینا تو وہ صاف کہہ دے گا "نئیں اے"

میں اس سے کہوں کہ مجھے 'سر اور کندھا' دینا تو یقین ہے کہ وہ حیرت سے اچھل پڑے گا کہ بندہ زندہ ہے اور کندھا مانگ رہا ہے جبکہ کندھا کسے دیا جاتا ہے؟......سب جانتے ہیں اور اگر میں اس سے انگریزی میں یہی بات کہوں کہ مجھے سیون اپ دینا تو وہ 'چٹا ان پڑھ' انگریزی فوراً سمجھ لے گا......اور میں 'سر اور کندھے' کی بجائے اس سے انگریزی میں کہوں کہ مجھے "ہیڈ اینڈ شولڈر" دینا تو وہ مجھے کچھ نہ کچھ دے ہی دے گا۔کچھ ایسا ہی حال اس 'کبڑے کے چشمے' کا بھی ہے۔

کہتے ہیں کسی زمانے میں دو افراد لڑتے تھے تو تیسرا فرد ان کے درمیان بیچ بچاؤ کروا کر چھڑانے کی کوشش کرتا تھا۔ایک زمانہ یہ ہے کہ دو افراد لڑ رہے ہوں تو تیسرے کے پاس موبائل کیمرہ بالکل تیار ہوتا ہے وہ مووی بنا کر فیس بک پر ڈال دیتا ہے لیکن یہ تیسری قسم کی لڑائی تھی جو بازار میں دو چھابڑی والوں کے درمیان ہو رہی تھی۔دیگر چھابڑی والے اور راہگیر ان کی لڑائی کو دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔نہ چھڑانے کے لیے کوئی آگے بڑھا تھا اور نہ ہی کوئی وڈیو بنا رہا تھا۔ ان کی دلچسپی ان کا حق تھا۔

ایک چھابڑی دار دوسرے کو گالیاں بھی دے رہا تھا اور اس کی کمر پر مکے بھی برسا رہا تھا جبکہ پٹنے والا ہنسی سے دہرا ہو رہا تھا......یہ بھی پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ کمر پر مکے کھانے سے دہرا ہو رہا ہے یا ہنستے ہنستے دہرا ہوا ہے اور دوسرے کو مارنے کی سہولت حاصل ہو رہی ہے؟

لوگ پہلے تو مذاق ہی سمجھے کہ یہ ساتھ ساتھ ہی ہوتے ہیں آپس میں مذاق کر رہے ہیں لیکن ایک کو شدید غصے میں دیکھ کر وہ اس خیال کو یقینی قرار نہیں دے سکتے تھے۔بالآخر چند دوسرے

افراد نے اسے سنجیدگی سے لیا اور قریب ہو کر اس لڑائی کی وجہ پوچھی۔ مارنے والا غصے سے بولا ''اسی حرامی سے پوچھ لو!''

وہ ''حرامی'' بجائے برا منانے کے اس بات پر بھی بڑی شدت سے ہنس پڑا۔ لگتا تھا اسے وجہ یاد آتے ہی، اس کے تصور سے ہنسی بھڑک اٹھی ہے۔ اسے ہنستے دیکھ کر دوسرے کا غصہ مزید بھڑک اٹھا ہے۔

آخر دو افراد نے پیٹنے والے کی بغل سے پکڑ کر اسے پیچھے کیا اور دو نے پٹنے والے کو پکڑ کر کھینچا۔ مارنے والے کی گالیوں میں جدید ترین اضافہ ہو رہا تھا اور پٹنے والا گالیاں کھا کے بھی شرمندہ نہیں ہو رہا تھا بلکہ بڑی ڈھٹائی سے ہنس رہا تھا۔

ہنسوڑے سے پوچھا گیا کہ ''کیا وجہ ہے تم ہی بتا دو۔''

یہ سن کر وہ پھر ہنس پڑا۔ ہنسی کے وقفے کے درمیان بولا ''اسی سے پوچھو مجھے کیوں مار رہا ہے'' اتنا کہہ کر وہ پھر ہنسنے لگا۔

دوسرا پھر اس کی جانب لپکا، گالیاں بکتا ہوا خود کو مصالحت کاروں سے چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔

پیٹنے والے نے بالآخر بتایا کہ ''بہت دیر سے میرا کوئی گاہک نہیں آیا تھا۔۔۔ ایک گاہک آیا تو اس نے اسے بھی بھگا دیا۔'' کہہ کر وہ پھر شدید غصے سے اسے گالیاں دینے لگا۔

پٹنے والے کو لوگوں نے برا بھلا کہا اور کہا کہ تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔۔۔ یہ تمہارا ساتھی ہے۔۔۔ آپس میں مل کر پیار محبت سے رہو۔ اس کا گاہک بھگا کر تم نے اچھا کام تو نہیں کیا جو پٹتے ہوئے بھی ہنس رہے ہو اس طرح اسے اور غصہ آ رہا ہے۔

پٹنے والا پھر ہنس پڑا اور بولا ''یار اگر تم دیکھ لیتے ناں! اس گاہک کو۔۔۔ تو تم بھی ہنستے۔''

''چپ کر حرامزادہ۔ میں تیری زبان نکال دوں گا جو ایک لفظ بھی بولا تو۔''

وہ بڑی ڈھٹائی سے پھر ہنسنے لگا، بولا ''اچھا بھائی! میں چپ کر جاتا ہوں۔'' پھر چھڑانے والوں سے بولا ''اسی سے پوچھو مجھے کیوں مار رہا ہے؟''

اب نہ وجہ یہ خود بتا رہا ہے نہ اسے بتانے کی اجازت دے رہا ہے۔۔۔ تو پھر جھگڑے کا فیصلہ کیونکر ہو؟

آخر پٹنے والے نے بتایا ''اس کے پاس گاہک آیا۔۔۔ اس نے اس سے ''کپڑے کا چشمہ'' مانگا۔''

''کپڑے کا چشمہ؟'' کئی حیرت بھری آوازیں ابھریں۔

''ہاں اسی طرح میں نے بھی حیران ہو کر دیکھا تو اس نے ٹنگے ہوئے بریزر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا ''ہاں یہ والا!''

لوگ ہنس پڑے تو ایک بولا ''تو تمہیں اس بات پر ہنسی آئی تھی؟''

''نہیں اس بات پر تو میں صرف مسکرایا تھا، ہنسی تو مجھے اس کے ناپنے پر آئی تھی۔''

''ناپنے پر؟ کیا مطلب؟'' ایک نے حیرت سے پوچھا۔

''جی ہاں! اس گاہک نے کپڑے کا چشمہ مانگا تو اس نے نمبر پوچھا کہ کس نمبر کا چاہیے تو گاہک بولا ''پتہ نہیں۔۔۔ نمبر شمبر کا تو مجھے نہیں پتہ! دکھاؤ۔۔۔ میں اندازہ کر لوں گا۔''

''اس نے اُس ''کپڑے کے دو تین چشمے'' دکھائے تو وہ انہیں بالشت سے ناپنے لگا۔۔۔ میں کیا کرتا؟ مجھے ہنسی آ گئی۔ گاہک شرما کر بھاگ گیا۔''

م۔ص۔ ایمن کا تعلق کراچی سے ہے۔ موصوف بہت اچھے افسانہ نگار اور بچوں کے ادیب ہیں اور بہت سے معیاری رسائل میں اِن کی کہانیاں تواتر سے شائع ہو رہی ہیں۔ ''بزمِ احبابِ ظرافت'' کے جوائنٹ سیکرٹری ہیں، جو کراچی میں خاصی فعال ہے اور کئی کامیاب محفلیں برپا کر چکی ہے۔ بہت اچھا مزاح تخلیق کرتے ہیں۔ اندازِ بیان میں شستگی اور شائستگی ہے۔ ''ارمغانِ ابتسام'' کے مستقل لکھنے والوں میں شامل ہیں۔

فقرہ بازیاں

سماجیات

کاکروچ مار لینے والی لڑکیاں مجھے انفرینڈ کردیں، کیونکہ جو کاکروچ مارسکتی ہیں وہ کچھ بھی مارسکتی ہیں۔

عامر راہداری

آج کل وہ لڑکیاں بھی ڈیٹ پر سینما میں فلم دیکھنے کی ضد کرتی ہیں جو عینک والا جن بھی پڑوسیوں کے گھر جاکے دیکھا کرتی تھیں۔

عامر راہداری

پاکستان وہ واحد ملک ہے جہاں ٹوٹا ہوا دل تیس روپے کے ایزی لوڈ سے بھی جڑ جاتا ہے۔

محمد علی بھٹی ایڈوکیٹ

اس بار سردی روٹھی ہوئی بیوی کی طرح برتاؤ کررہی ہے، بیگ لیکر دروازے تک جاتی ہے اور پھر واپس آجاتی ہے۔

ایم عادل گلزار

محبت کی شادی عشق میں ناکامی اور عید کی چھٹیوں کے بعد بندے کو نارمل ہونے میں ٹائم لگتا ہے۔

ڈاکٹر عطاءاللہ عالی

ہمارے ہاں بچوں کو قرآن پڑھانے والے قاری کی فیس، فطرانے کی رقم، اور بی وی کی نظر میں شوہر کی قیمت کبھی نہیں بڑھتی۔

ڈاکٹر عطاءاللہ عالی

کراچی اور لاہور کے لڑکوں میں بس اتنا فرق ہے کہ لاہور والے لڑکی سے نمبر لیتے ہیں جبکہ کراچی والے موبائل ہی لے جاتے ہیں۔

دانش کیانی

پاکستان میں گمشدہ چیز ڈھونڈنے کا طریقہ ''اُٹھ تیرے تھلے ای ہونی اے۔''

فیض عباسی

پاکستانیوں کو اپنا قومی کھیل شطرنج بنالینا چاہیئے، چالیں چلنا تو سب ہی کو آگئی ہیں۔

جنید ہارون خطانہ

میری ہمیشہ یہی کوشش، ہوتی ہے کہ ان لوگوں کی غلطیوں سے سبق حاصل کروں جو میرے مشوروں پہ عمل کرتے ہیں۔

آنسہ چوہدری

وہ لڑکیاں جو بسکٹ کھاتے ہوئے پیکٹ میں چورا بھی نہیں چھوڑتی وہ بھی بول رہی ہوتی ہے جانو میں تمہارے لیئے دنیا بھی چھوڑ سکتی ہوں۔

عمیر میری

ٹیکسی، رکشہ کو گھنٹوں انتظار کروانے والی آنٹیاں اب لپ اسٹک کا آخری ٹچ دینے کے بعد کریم سروس کی آپشن ''چلو'' کا بٹن دباتی

ہیں۔

کے ایم خالد

گھر دامادوں سمیت بیشتر شوہر صاحبان کی عظمت کو سلام جن کا کچن میں افطاری کرتے ہوئے آج انتیسواں روزہ ہے۔

کے ایم خالد

یہ تحقیقی دعویٰ کس سائنسدان کا ہے کہ چائے کی ”پیالی میں چینی نہ ڈالیں اور سارا دن چمچ ہلاتے رہیں تب بھی چائے میٹھی نہیں ہوگی۔“

م۔ص۔ایمن

کرکٹ

اللہ کرے ورلڈ کپ کے سارے میچوں میں بارش آجائے اور آخر میں قرعہ اندازی ہو اور پاکستان جیت جائے ،سب بولو آمین۔

ایم فاروق بلوچ ایڈووکیٹ

پاکستانی ٹیم اگر خود ہارنا چاہے تو دنیا کی کوئی ٹیم اس کو جتوا نہیں سکتی۔

ویر تنویر

پاکستانی ٹیم کی ایک ہی سزا ہونی چاہیئے،سرفراز واپسی پر جہاز چلائے۔

جنید ہارون خطانہ

پاکستانی ٹیم وہ خراب بندوق ہے،جس سے مالک بھی ڈرتا ہے اور چور بھی ڈرتا ہے۔

ایم عادل گلزار

ادھر بارش نہیں ہو رہی ،ادھر بجلی بھی نہیں جا رہی ۔ پورا میچ دیکھا نہیں جا سکتا اوپر سے سنڈے کہاں جائیں جگہ جگہ ٹی وی لگا ہے۔

ڈاکٹر عطا اللہ عالی

پاکستانیو! میچ جتنا انجوائے کرنا ہے کرلو۔۔۔جب تک میچ شروع نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر عطا اللہ عالی

نیب کا سرفراز اور انضمام کو گرفتار کرنے کا فیصلہ ٹاس جیت کے نہ کھیلنے کے فیصلے سے قومی معیشت کو نقصان،امریکا چین اور روس کی ترقی کی ایک وجہ کرکٹ سے دوری بھی ہے،کیا خیال ہے۔

ڈاکٹر عطا اللہ عالی

زمین گول ہے۔۔۔۔ذرا تماشا ملاحظہ فرمائیں۔۔۔انگلینڈ کی ٹیم نے افغانستان کا حشر کر دیا ہے، افغانستان نے ہمارا اور ہم نے انگلینڈ کا۔

محمد عباس مرزا

ہم نے ایک ایسے شخص کو کرکٹ ٹیم کا کیپٹن بنایا ہوا ہے جسے Uber اور Careem والے بھی کیپٹن نہ رکھیں۔

عامر راہداری

اب مجھے جب بھی اونگ آتی ہے،یقین جانیے سرفراز کو گالی جاتی ہے۔

ایم گلزار عادل

میچ اگر پاکستان کے کسی کرکٹ اسٹیڈیم میں ہوتا تو پھر ایک ایک پوائنٹ پکا تھا ہم سے کہاں دو دن پچ اور گراونڈ خشک ہونا تھا۔

کے ایم خالد

جب سے ICC نے ٹورنامنٹ شیڈول اناؤنس کیا تھا، اس وقت سے اس میچ کا انتظار تھا اور آج۔۔۔خادم حسین رضوی کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔

محمد علی بھٹی ایڈووکیٹ

میچ ہو یا لڑکی، پاکستانی ایک دفعہ پھنسانے کی حتی الامکان کوشش ضرور کرتے ہیں۔

عامر راہداری

سیاسیات

پرانا محاورہ: وہی کتے کی ایک ٹانگ
نیا محاورہ: وہی بریانی کی ایک پلیٹ

وحید اختر واحد

کدو کٹے گا تو سب میں بٹے گا!اپوزیشن اتحاد کا ون پوائنٹ ایجنڈا!

وحید اختر واحد

مریم نے بلاول کو راکھی باندھی،اس موقع پر زرداری نے دو بکرے

قربان کئے اور بلاول کو دیکر کہا۔۔۔جا پتر، اک تیری سری اک تیری پین دی سری!

محمد اقبال قریشی

ایک ہی صوفے میں پھنس گئے، بلو، مریم، حمزہ شہباز
نہ کوئی بھٹو رہا، نہ ضیا نا نواز
چپ کر کے چس لو، شعر دا وزن نا ویکھو!

وحید اختر واحد

محترم فواد چوہدری کے ہاتھ پر اپنا منہ مارنے پر ہم سمیع ابراہیم جیسے لعنتی شخص کی بھرپور مذمت کرتے ہیں۔

عامر راہداری

اگر کسی سے عیدی لو تو ساتھ رسیدیں لینا مت بھولنا۔۔۔باؤ جی کا جیل سے قوم کے لیئے پیغام۔

ڈاکٹر عطا اللہ عالی

پاکستان میں عید الیکٹرو دھکڑ کا چاند نظر آ گیا ہے، دوسرے علاقوں کے رہنے والے اپنے مقامی چیئرمین نیب سے رابطہ کریں!

وحید اختر واحد

یہ کس پاکستانی فلم کا مشہور ڈائیلاگ ہے؟ میری باہر تو کیا پاکستان میں بھی کوئی پراپرٹی نہیں ہے۔

ڈاکٹر عطا اللہ عالی

میری طبیعت ٹھیک نہیں، کوئی نیب گزیدگی کا منتر بتاؤ، سرکاری خرچ پر علاج کروانا چاہتا ہوں۔

نوید ظفر کیانی

چیئرمین نیب

سینس منسٹر فواد چوہدری اور نیب کی مشترکہ تحقیق، حیاتیات کی نئی شاخ "چمیاں لوجی" کی داغ بیل!

وحید اختر واحد

بریکنگ نیوز: چیئرمین نیب بوسے پر ایکسپائری ڈیٹ لگانا بھول گئے۔

وحید اختر واحد

ہمارے ہاں ڈوپٹے کی پیکو کے ساتھ ساتھ بوسہ کناری کا کام بھی تسلی بخش کیا جاتا ہے! منجانب نیب

وحید اختر واحد

ٹھرکنا، پھڑکنا، پھڑک کر ٹھرکنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

وحید اختر واحد

عید کا چاند

خدا کرئے کہ میری ارض پاک پر اترے
وہ ہلال عید، جسے اندیشۂ فواد نہ ہو

کے ایم خالد

پو پلزئی کو رضوی جانی کی طرح آٹھ روزہ جسمانی ریمانڈ پر اندر کر کے نیا سوفٹو ئیر انسٹال کیا جائے! عوامی مطالبہ۔

وحید اختر واحد

اردو ادب

تلفظ کی مَرمّت کے اِس مشغلے میں اپنی ہی شامت آئی ہے۔اکثر ملنے والے اپنا تلفظ درست کرنے کی بجاۓ، تاک میں رہتے ہیں کہ کب میں دورانِ گفتگو چُوک جاؤں اور وہ میری گرفت کریں۔ میرے ہمزاد پُرجوش پوری کے بقول۔۔۔یہ وہی بات ہوئی کہ چھریاں تیز کر کر کے، اپنے ہی قتل کا سامان کرو ہو۔

نادر خان سرگروہ

اُردو کے بارے میں گفتگو کرنے سے زیادہ ضروری ہے کہ اردو میں گفتگو کی جائے۔

رخشاں ہاشمی

کسی ''کہنی مشق'' شاعر یا مصنف سے واقفیت ہے تو بتائیں۔ہم نے اب تک کسی کو کہنی سے مشق کرتے نہیں دیکھا۔''

م۔ص۔ایمن

ارمغانِ ابتسام کا اگلا شمارہ نئے قہقہوں کے ساتھ

اُردو طنز و مزاح پر مبنی دو ماہی برقی مجلّہ

ارمغانِ ابتسام

جولائی، اگست ۲۰۱۹ء

مُدیر:

نوید ظفر کیانی